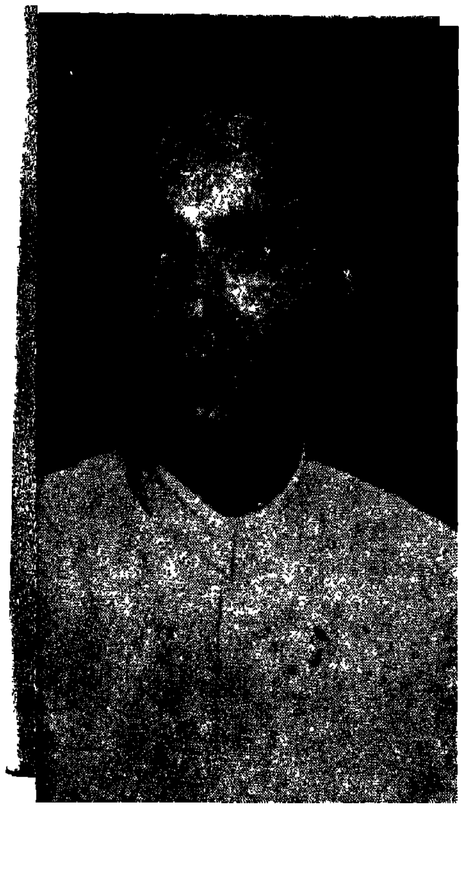
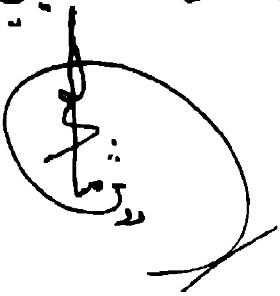
صبح

روشن نمبر



ترقی اردو (ہند) دلی

لاکھ عالم ہیں یہاں حسن گماں سے پیدا
سوچتا ہوں کہ تقاضائے یقیں کیا ہوگا



سہ ماہی

صبح

روش نمبر

(۱۹۷۱ء کا پہلا شمارہ)

مرتبہ

عبداللطیف اعظمی

ناشر

انجمن ترقی اُردو ہند شاخ دلّی

مجلسِ ادارت

مالک رام　　　حمیدہ سلطان
عتیق صدیقی　　　بہار برنی
خلیق انجم

اڈیٹر : عبداللطیف اعظمی

اس شمارہ کی قیمت : ۳/۵۰

ملنے کا پتہ:
جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو
علی منزل۔ کوچہ پنڈت دہلی ۶

طابع وناشر : بہار برنی
مطبوعہ : جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی



حضرت رِوش صدیقی بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ مصروفِ گفتگو

فہرست مضامین

عبداللطیف اعظمی

پہلی کرن

حالاتِ زندگی اور تنقیدی اور تاثراتی مضامین

منظوم خراجِ عقیدت

قطعاتِ وفات اور لوحِ تربت

پہلی کرن

صبح کے جواہر لال نہرو نمبر اور مولانا ابو الکلام آزاد نمبر کے بعد اب ساحرؔ نمبر حاضر ہے۔ ہم نے مرحوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مضامین حاصل اور جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں نئے مضامین بھی شامل ہیں جو اسی اشاعت کے لئے لکھے گئے ہیں اور ایسے مضامین، نظمیں اور قطعاتِ وفات بھی جو اُن کی وفات پر مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ نیز ہم نے مرحوم کے مختلف اصنافِ سخن کا ایسا انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے ان کی شعری خصوصیات اور ان کا مخصوص رنگ اُجاگر ہو سکے۔ محدود صفحات کی وجہ سے انتخاب میں ہمیں پوری آزادی نہیں تھی، پھر بھی ان کا نمائندہ کلام اس میں آگیا ہے۔ رباعیوں کی تعداد یقیناً کم ہے، لیکن شاید مرحوم کو اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

مرحوم کے اب تک صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں "کارواں" کے نام سے ایک طویل نظم اور اگست ۱۹۵۶ء میں "محرابِ غزل" کے نام سے غزلوں کا ایک مجموعہ۔ اس میں سب سے پرانی غزل ۱۹۲۴ء کی ہے اور سب سے آخری اگست ۱۹۵۴ء کی۔ اس نمبر میں کوئی ایسی غزل نہیں ہے جو "محرابِ غزل" میں شامل ہو، سوائے پہلی

غزل کے (صفحہ ۱۵۱) جسے ایک دوست نے "نئی روشنی" سے نقل کر کے بھیجا تھا، ہمیں بالکل آخر میں معلوم ہوا کہ کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ یہ "محرابِ غزل" میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ غزلیں یا تو ماہنامہ "جامعہ" سے لی گئی ہیں، جن پر تاریخِ اشاعت دیدی گئی ہے یا مسودے کی صورت میں مرحوم کے صاحبزادے جناب شاہد سعید صاحب سے ملی ہیں، جن پر غیر مطبوعہ لکھ دیا گیا ہے۔ کچھ غیر مطبوعہ غزلیں میرے پاس بھی تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی غزل کہیں شائع ہوئی ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔ مطبوعہ غزلوں کی آخری چار غزلوں پر ۱۹۷۰ء درج ہے۔ یہ غزلیں مرحوم کے انتقال کے بعد ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ جامعہ میں چھپی ہیں، مگر انہیں مرحوم نے نومبر ۱۹۷۰ء میں جامعہ میں شائع کرنے کے لئے مجھے دیا تھا۔ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ ان کی وفات کے بعد کی تاریخ دی جائے، اس لئے ۱۹۷۰ء لکھ دیا ہے۔

روشؔ مرحوم اُن چند شعراء میں سے تھے جو اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ میری درخواست پر حضرت جگؔر پر ایک تقریر کی تھی، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اپنے ہم عصر شعراء کے بارے میں ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا ہے، اس لئے میں نے اُن سے درخواست کی کہ اہم شاعروں اور مشاعروں کے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات قلم بند فرمادیں۔ انھوں نے حسبِ عادت بڑی گرم جوشی کے ساتھ وعدہ فرمایا مگر متعدد یاددہانیوں کے باوجود وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرسکے۔ ان کے کاغذات میں جو مختصر اور نامکمل مضامین ملے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ نثر کی طرف توجہ کرتے تو اس میں بھی بڑا نام پیدا کرتے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی شگفتہ اور دلکش ہے۔ وہ شاعری کی تمام نزاکتوں کے خود شناس اور رمز شناس تھے اس لئے انھوں نے شاعروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ اور قابلِ قدر ہے۔ مرحوم کے خطوط شامل کرنے کا فیصلہ عین وقت پر کیا گیا، اس لئے زیادہ تعداد میں نہ مل سکے مگر جس قدر بھی

ہیں ان سے مرحوم کی شخصیت اور ان کے خیالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

آخر میں وہ دونوں غزلیں پیش کی جاتی ہیں جن کو شاہجہاں پور کے مشاعرہ میں پڑھتے وقت مرحوم پر دل کا دورہ پڑا تھا اور بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔

زندگی کو ہوسِ زلفِ صنم ہے تو سہی
فرصتِ عمرِ ابد بھی مجھے کم ہے تو سہی
کہیں آ گئے نہ گئے تیرے خرابات نشیں
یوں تو اک سلسلۂ دیر و حرم ہے تو سہی
معنیٔ شمعِ حرم کچھ بھی ہوں واعظ لیکن
صورتِ شعلۂ رخسار صنم ہے تو سہی
کون مسجودِ نظر ہے یہ کھلے یا نہ کھلے
میری آنکھوں میں ترا نقشِ قدم ہے تو سہی
تیرے کوچے ہیں یہ اک گوشۂ اربابِ جنوں
حاصلِ مدرسۂ لوح و قلم ہے تو سہی
یہ جو طوفانِ حوادث میں بھی شاداں ہے آزادؔ
کچھ اشارہ ترا اے چشمِ کرم ہے تو سہی

اس غزل کے بعد جب دوسری غزل کا تقاضا ہوا اور تقاضے نے شدت اختیار کی تو مرحوم نے فرمایا کہ مجھے آپ لوگوں کو اپنا کلام سنانے میں خوشی ہوتی ہے مگر کیا کروں سینے میں درد ہو رہا ہے اور اس شدید سردی میں بھی پسینہ چھوٹ رہا ہے، پھر بھی آپ کی خاطر ایک تازہ غزل کے چند شعر پیش کرتا ہوں:

یہ جو احساسِ تشنہ کامی ہے　　　بادۂ آرزو کی حامی ہے

بوالہوس! تجھ کو کون سمجھائے — زندگی دردِ ناتمامی ہے
ہم ملامت زدہ کہاں جائیں — شہر میں دورِ نیک نامی ہے
جلوۂ رہ گزر نگاہ طلب — زندگی محوِ تیز گامی ہے
آج ملبوسِ کج کلاہی میں — آبرو باختہ غلامی ہے
کاش تجھ کو ملے نگاہِ بلند — کیوں اسیرِ بلند بامی ہے
اے زوش کون اس صنم سے کہے
خلق مشتاقِ ہم کلامی ہے

آجکل کسی مخصوص موضوع پر کوئی خاص نمبر نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔ اچھے مضمون نگاروں کی کمی ہے اور جو ہیں ان سے وقت پر کچھ لکھوا لینا آسان کام نہیں۔ اس کے علاوہ کاتبوں اور لیتھو طباعت کی دشواریاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ہمیں خوشی ہے کہ یہ زوش نمبر ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے کامیاب ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئینِ "صبح" کو بھی پسند آئے گا۔ محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ مجلس ادارت میں شامل ہیں، اس لئے ان کا شکریہ ادا کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، مگر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ نمبر تمام تر ان ہی کی توجہ اور کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ مرحوم کے صاحبزادے جناب شاہد سعید کا خاص طور پر شکر گذار ہوں کہ ان کی وجہ سے اس نمبر کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد ملی۔

عبداللطیف اعظمی

۱۶ر اکتوبر ۱۹۷۱ء



کل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس کے مشاعرہ میں رَوِش صاحب نغمہ خواں ہیں

حالاتِ زندگی

اور

تنقیدی و تاثراتی مضامین

ضیاء الحسن فاروقی

۱

۲۳ جنوری کی صبح کو معلوم ہوا کہ رات میں شاہجہاں پور میں جہاں وہ ایک مشاعرہ کی شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے جناب روش صدیقی پر دل کا سخت دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہر چند کہ دل اس حادثہ کی تکلیف دہ اور افسوسناک خبر پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، اور جی میں یہ بات رہ رہ کر آتی تھی کہ وہ تو اچھے خاصے تھے، کبھی کسی عارضہ کا ذکر نہیں کیا، ہر حالت میں خوش رہتے تھے اور بھرپور قہقہے ان کی شخصیت کا جزو تھے، ابھی کیسے اس دنیا کو خیرباد کہہ سکتے ہیں، لیکن پے بہ پے لوگوں نے یہ خبر دی اور ناچار اس خبر پر یقین کرنا پڑا۔ سوچتا ہوں، اہل وعیال سے دور، غریب الوطنی میں جب دورۂ قلب کے ہیجان و اضطراب کے دوران کوئی لمحہ ایسا گذرا ہوگا کہ انھیں اپنوں کی یاد آئی ہوگی تو ان کے مضروب قلب پر کیا بیتی ہوگی، پھر کس طرح ان کے ایمان و ایقان نے تسلیم و رضا کی خنک خنک، روح پرور کیفیت کی لذت انھیں بخشی ہوگی اور وہ شاداں و فرحاں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے ہوں گے، انھیں کا شعر ہے:

ایک پردہ ہے رنگ خاموشی
ہم سخن جانِ کائنات سے ہوں

جناب شاہد عزیز روش صدیقی ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جوالاپور ضلع سہارنپور میں

میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولوی خلیل احمد شاؔہد نے گھر ہی پر ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ ابتداً اردو اور فارسی کی تحصیل کی، پھر ہندی اور سنسکرت میں استعداد بہم پہونچائی اور بعد میں انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت پیدا کی۔ جوالا پور گورو کل (کانگڑی) سے متصل ہے اور رؔوش صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ہندی اور سنسکرت میں جو کچھ بھی انھوں نے حاصل کیا وہ گورو کل ہی کی دین تھی۔ شعر و سخن سے انھیں فطری مناسبت تھی، جوالا پور کے مناظر فطرت کی آغوش میں اُن کی خدا داد شعری صلاحیتیں پروان چڑھیں، انھیں اگر کسی سے تلمذ تھا تو جوالا پور کے مناظر فطرت اور اپنے والد ماجد حضرت شاؔہد سے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم ابھی کم سن ہی تھے کہ شعر کہنے لگے، کسی نے انھیں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کے سب سے پہلے دو شعر یہ ہیں:

یہ میرے ضبطِ محبت نے کی عجب تاثیر | کہ ان کو ضبطِ محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو | بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

رؔوش صاحب نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں اور دونوں اصناف میں اُن کا مرتبہ و مقام مستند تھا، 'محرابِ غزل' میں اُن کی سب سے پرانی غزل ۱۹۲۴ء کی ہے، نظمیں بھی اُس وقت سے ملک کے مشہور ادبی جرائد میں شائع ہوتی اور رؔوش کی مقبولیت میں اضافہ کرتی رہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن اُن کی غزلیں بھی ارباب فہم و دانش کے نزدیک خوبصورت اور معیاری ہیں اور بسا اوقات ان میں فکر کی گہرائی اور تشبیہات و تراکیب کی گیرائی ایسی فنکارانہ ہم آہنگی... ساتھ ملتی ہے کہ ان کا آہنگ الہامی معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ان... معاصرین میں کم کم ملتی ہے۔ ان کی وطنی و سیاسی نظموں میں الفاظ کا وہ گھن گرج، عبارت کا وہ زور شور اور لہجہ کا وہ طنطنہ نہیں جو جوؔش ملیح آبادی کی خصوصیت ہے، ہمیں اُن کی ایسی نظموں میں وہ چیز ملتی ہے جو عام طور پر جوؔش

کے یہاں نہیں پائی جاتی، یعنی آفاقی نقطۂ نظر، شعور کی پختگی، خیال کی رعنائی اور عزم کی متانت وسنجیدگی، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں غضب کی تاثیر تھی اور قاری کے دل ودماغ پر چھا جاتی تھیں۔ ان کی رومانی نظموں کی خصوصیت ان کا تغزل، ترنم اور روانی ہے، ساتھ ہی بعض معرکۃ الآرا نظموں میں خوش فکری اور خوش نظری بھی ملتی ہے اور اس لحاظ سے ان کی اکثر نظمیں بہت ہی قابل قدر ہیں، ذیل میں ہم ان کی دو نظموں کے ایک ایک بند نقل کرتے ہیں، ایک سیاسی ہے اور ایک رومانی :

شمع آزادیٔ مشرق کو فروزاں کر دیں

ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ دوراں کا غلام
ایک ذرہ بھی نہیں مہرِ درخشاں کا غلام
ایک تنکا بھی نہیں صحنِ گلستاں کا غلام
کوئی انسان ہو پھر کیوں کسی انساں کا غلام

دہر کو جنتِ آزادیِ انساں کر دیں

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانیِ احساس جھکی جاتی ہے
حیرتِ عالمِ امکاں کو خبر ہو شاید

روشؔ صاحب کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، میں نے ایسے اچھے شاعر بہت کم دیکھے ہیں جن میں دوست نوازی، وضعداری، منکسر المزاجی، دلدہی، دلداری، شرافت، تہذیب نفس اور مشرقی تہذیب کی قدروں کا ہوبہو احترام جیسی قابل قدر

خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ بحیثیت شاعر وہ شاعری کی قدیم روایات اور صحتمند رجحانات کے حامل تھے، افسوس اُن کے انتقال سے ایک شریف انسان اور ادب کی ثقہ روایات کا ایک نمایندہ اُٹھ گیا۔ وہ ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور کسی کی دل آزاری کو سخت گناہ تصور کرتے تھے، اُن کی زندگی اور معمولات پر تصوف اور اس کی جاندار و اعلیٰ قدروں کا بہت گہرا اثر تھا، ان کے کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے میں تصوف اور صوفیائے کرام سے متعلق بڑی نادر کتابیں تھیں ان میں سے بعض کتابوں کو تو انھوں نے بار بار پڑھا تھا اور ان کا جب ذکر کرتے تھے تو بڑے گہرے احساس سے کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی روحانی کیفیات کچھ اور ہیں، میں نے اُن میں خودداری اور مردانگی کے جوہر بہت کچھ دیکھے اور محسوس کئے، مصائب اور ناخوشگوار حالات میں جن کا ۱۹۴۷ء کے بعد انھیں گذشتہ تین چار سال سے دوسری بار سامنا تھا، راضی برضا اور ایک متصوفانہ احساس تشکر کے ساتھ خوش رہنا ان کا شیوہ تھا۔ یہ وہ وصف ہے جو اللہ کے خاص بندوں میں ملتا ہے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے مرحوم بڑے راسخ العقیدہ نیشنلسٹ تھے، یہاں تک کہ صبر آزما حالات میں ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کی نیشنلزم میں معمولی سی کمزوری نہیں آئی، ان کے ایک دوست شری پی، ایس، سیٹھی نے کہا ہے کہ " ۱۹۴۷ء کے فسادات میں پنڈت پنت کے ایما پر میں جب مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا تھا تو ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ روش صاحب کے قصبہ جوالاپور پر فسادیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں وہاں پہونچا اور روش صاحب کو حیرت زدہ پایا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ یہ سمجھ نہیں پائے کہ ہندو مسلمان کیوں آپس میں لڑتے ہیں، اللہ کے بندے ہیں اور آپس میں محبت و آشتی سے رہنا چاہئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ انھیں پاکستان جانے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے مگر وہ اپنے وطن (ہندوستان) کو چھوڑنے کے لئے کبھی تیار

نہیں ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انھیں پاکستان کے اعلیٰ حکام بڑے انعام واعزاز دینے کے لئے تیار تھے لیکن روش صاحب نے پاکستان جانا گوارا نہیں کیا۔" برادر محترم جناب قیصر زیدی صاحب فرماتے ہیں کہ "مئی ۱۹۴۸ء میں مسوری میں ایک مشاعرہ تھا، مشاعرہ میں ثاقب لکھنوی مرحوم، حکیم آزاد انصاری مرحوم، احسن مارہروی مرحوم، بیخود دہلوی مرحوم، شوکت تھانوی مرحوم کے علاوہ ملّا صاحب فراق، ساغر اور دیگر مشاہیر وقت کے ساتھ ایک آپ کا یہ غیر معروف ساتھی شریک تھے، صدارت مرحوم سر سید سلطان احمد نے فرمائی تھی اور یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ ہم چند احباب کی فرمائش پر روش مرحوم نے اپنی نظم 'شمع آزادی مشرق کو فروزاں کر دیں' پڑھی اور یہ نظم براڈ کاسٹ بھی ہوئی، یہ وہ پہلی نظم ہے جو آل انڈیا ریڈیو سے آزادی کے سلسلے میں تمام کائنات میں نشر ہوئی۔" آزادی کے بعد، بلکہ یوں کہیے کہ تقسیم ملک اور آزادی کے بعد، نیشنلسٹ مسلمانوں کی نیشنلزم پر بھی شبہ کرنے والا ایک طبقہ پیدا ہو گیا اور اس طبقہ کے بعض افراد کی سنگ دلانہ حرکت کی وجہ سے روش کو اکثر سخت قسم کی روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا پڑا، لیکن اس مرد حق بیں وحق آگاہ کے پائے ثبات میں، ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش نہیں پیدا ہوئی، ورنہ جوش ملیح آبادی کی طرح دنیوی منافع سے عارضی لطف اندوزی کے لئے وہ کوئی عذر لنگ پیش کر کے سرحد اُس پار چلے جاتے۔ وہ یہیں رہے اور اسی میں مرے، ایک آن کے ساتھ، ایک وقار کے ساتھ۔ اس کی پروا انھوں نے نہیں کی کہ ادیبوں اور شاعروں کی گٹ بندیاں اُن کے جائز مرتبے کو پہچاننے سے دیدہ و دانستہ گریز کرتی ہیں، قدیم کے 'افراط' اور جدید کے 'تفریط' اُن کی شاعری کی عظمت کو سمجھ نہیں سکے، ملک و قوم نے اُن کی پُر خلوص ادبی خدمات کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو فقر و درویشی کی عظمت کسے یاد آئے!

فراغِ دل، سر و ساماں میں ڈھونڈنے والے
فراغِ بے سر و ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(روش)

مرحوم (روش صدیقی) اپنے اوصاف اور خصوصیات میں منفرد تھے، جس کی مثال اس دور کے شعراء میں کم ملے گی، وہ جس درجے کے شاعر تھے، اسی درجے کے انسان بھی تھے، ان کی موت سے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا ایک پیکر اٹھ گیا۔ ان میں مشرقی تہذیب کی ساری خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں۔ شاعری میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، وہ صاحب طرز شاعر تھے، سیکڑوں شعراء میں ان کا کلام ممتاز نظر آتا تھا۔ وہ ان شعراء میں تھے جن سے شاعری کا بھرم اور وقار قائم تھا، ان کو نظم اور غزل دونوں میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کی نظموں میں تغزل کی لطافت و رنگینی اور غزلوں میں تغزل کے کیف و سرور کے ساتھ نظم کا شکوہ و تجمل ہوتا تھا۔ ان کی فارسی استعداد بہت اچھی تھی اور اس کا سارا حسن ان کے کلام میں جلوہ گر تھا۔ ظاہری حسن کے ساتھ معنوی حیثیت سے اس میں بڑی بلندی اور پاکیزگی تھی۔ مذہب میں راسخ العقیدہ اور عملاً پابند مذہب مرد مومن تھے، اس سے ان کو دنیاوی نقصان اٹھانا پڑا، مگر اس کی انھوں نے مطلق پروا نہ کی۔ ان کی شخصیت بڑی دل آویز تھی، بوٹا سا قد، ہنستا ہوا شگفتہ و شاداب چہرہ، اس پر اخلاص و محبت کی موجیں دل کو کھینچ لیتی تھیں۔

مولانا شاہ معین الدین ندوی (معارف، فروری ۱۹۷۱ء)

مالک رام

(۲)

آرزو مرحوم ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء[1] کو جوالاپور (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص کرتے تھے۔ وہ ملا محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" کے عاشق تھے۔ اس مثنوی کا مطلع ہے:

بنام شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

اسی سے انھوں نے شاہد تخلص اختیار کیا تھا اور اب خدا نے بیٹا دیا تو اس کا نام انھوں نے شاہد عزیز رکھ دیا۔ مثنوی "نیرنگ عشق" کے

---

[1] بعض تذکروں میں ان کی تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپی ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے، مرحوم نے خود ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جنوری/فروری ۱۹۴۱ء میں نگار (لکھنؤ) نے تذکرۃ الشعراء نمبر شائع کیا تھا تو نیاز نے ان سے بھی حالات طلب کیے تھے، خدا معلوم کیسے وہاں تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کی بجگہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپ گئی، اس کے بعد چونکہ سب لکھنے والوں نے حالات وہیں سے نقل کیے اس لیے عام طور پر یہی تاریخ مشہور ہو گئی۔

یہی دو کردار ہیں، شاہد اور عزیز۔

گھر کا ماحول مذہبی تھا ہی، تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی بھی اچھی جانتے تھے اور یہ ان کے وطن جوالا پور سے گورو کل کے قرب کا فیضان تھا۔ بعد کو سنسکرت اور انگریزی سے بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی تھی۔

رَوش تقسیم ملک تک جوالا پور میں رہے۔ یہاں وہ بانس کا کاروبار کرتے تھے اور اس سے ان کی گذر بسر کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ آزادی کے ساتھ فساد آئے؛ جوالا پور میں بھی بہت سخت ہنگامہ ہوا، اسی میں رَوش کا مکان بھی نذرِ آتش ہو گیا۔ یہ جان بچا کر مراد آباد پہنچے اور یہاں مولوی مظہر جلیل صاحب کے مکان میں پناہ لی۔ مولوی صاحب موصوف یہاں کے شرفا اور اصحاب علم میں سے تھے، وہ رَوش صاحب سے اتنے خوش تھے کہ جب رَوش کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور ایک زمانہ بعد انھوں نے دوسری شادی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو موصوف نے اپنی بیٹی (سعیدہ) ان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔ رَوش صاحب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک مراد آباد میں رہے۔ ان کی دوسری بیوی کی ایک خالہ میرٹھ میں تھیں۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں خاندان میرٹھ منتقل ہو گیا اور محلہ مشائخان میں انھیں کے مکان میں رہنے لگا۔

جوالا پور سے نکلنے کے بعد رَوش نے ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ درمیان میں کوئی چار سال (۱۹۵۹ء — ۱۹۶۳ء)[1] کے لیے آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ اردو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے، لیکن کجا شاعر، کجا دفتر کی بکواس، وہ اس گون کے آدمی نہیں تھے،

---

[1] ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں مع خاندان کے ان کا قیام نئی دہلی میں سرکاری کوارٹر میں تھا۔ لطیف اعظمی

یہاں کا نظامِ اوقات اور دوسری دفتری زندگی کی پابندیاں، یہ بھلا کہاں ان کے بس کی بات تھی۔ بالآخر پرچہ گذرا کہ یہ کام پر توجہ نہیں دیتے، دفتر سے دن دن بھر غائب رہتے ہیں، انجام کار انھیں الگ کر دیا گیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں وہ برسلز (بلجیم) کے سہ سالہ جشنِ شعر میں ہندستان سے اردو کے نمایندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے؛ یوں یورپ کے بعض مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔

رَوش بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے اور ان میں آغاز ہی سے پختگی کے آثار تھے۔ کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، کچھ تھوڑا بہت مشورہ کیا، تو اپنے والد مرحوم سے۔ کلام میں تصوف اور ویدانت کے اثرات بہت گہرے اور نمایاں ہیں اور یہ ان کے ماحول کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا تخلص 'روش' فارسی کا لفظ نہیں ہے، یہ سنسکرت کا 'روی الیش' (یعنی سورج دیوتا) ہے، جو ان کے کسی فاضل سنسکرت ہندو دوست کا عطیہ تھا۔ بہت ابتدا ہی میں ان کے کلام کی پختگی سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا اور وہ انھیں کوئی سن رسیدہ شخص سمجھنے لگے تھے۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ن، م، راشد نے، جو اس وقت چودھری نذر محمد راشد تھے، رَوش سے اصلاح بھی لی۔ رَوش نے ۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۳ء میں بہاولپور کے ایک صاحب سید مبارک شاہ جیلانی (وفات: ۲۱ نومبر ۱۹۶۹ء) کے ساتھ مل کر ایک تماہی پرچہ 'لالۂ صحرا' بھی جاری کیا تھا، لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکل کر رہ گیا۔ وہ نظم بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ شروع میں چند غزلیں کہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے مدتوں اپنے آپ کو نظم ہی کے لیے وقف رکھا اور اس میں امتیاز پیدا کیا۔ ان کی بعض نظمیں (مثلاً کارواں، مرثیۂ گاندھی وغیرہ) اردو کی آبرو کہی جانے کی مستحق ہیں۔ افسوس کہ 'کارواں' نظم والے کتابچے (بمبئی ۱۹۵۰ء) اور ایک مجموعۂ غزلیات 'محرابِ غزل' (دلی ۱۹۵۶ء) کے علاوہ ان کا اور کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کا سرمایۂ سخن دو تین مجموعوں سے زیادہ

کا ہوگا۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ ہے۔ فارسی کی شگفتہ اور دلآویز ترکیبیں ایسی برجستگی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے، لیکن شاعر سے بھی زیادہ وہ بہت اچھے انسان تھے، مرنجاں مرنج، نیک نفس، پابندِ صوم و صلوٰۃ، دیندار ـــ میں انھیں ۲۰۔۲۵ برس سے جانتا تھا، ہمارے موجودہ دور کے اکثر شاعروں کی عام روش کے خلاف میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کے خلاف ایک کلمہ تک نہیں سنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہاں مرحوم کی ایک سخن گسترانہ بات یاد آگئی: پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں حفیظ جالندھری حکومت ہند کے اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے، جس کے ذمے گانے بجانے اور کھیل تماشے کے ذریعے سے حکومت کے فوجی پراپگنڈے کا کاروبار تھا۔ بعد کو ان کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں سرکار کی طرف سے انھیں 'خاں بہادر' کا خطاب عطا ہوا۔ (خاں صاحب، وہ بہت پہلے سے تھے) اس پر رَوش نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں اقبال کے مشہور شعر کی تلمیح ہے:

آتجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

رَوش کا قطعہ ہے:

اقبالؔ کے عرفاں میں تقدیرِ امم یہ ہے
'شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر'
رقّاصِ حکومت کی معراج یہ کہتی ہے
طاؤس و رباب اوّل، اعزاز و خطاب آخر

شعری حلقوں میں بھی ان کے فن اور انسانیت کے باعث ان کا وقار تھا۔ خدا اپنے فضل و کرم سے انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

علی جواد زیدی

(۳)

عروج و زوال کی بات کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا کہ ؎
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس

لیکن رَوِش صدیقی کی زندگی ایک ہی طرح پر بسر ہو گئی۔ شروع سے آخر تک ان کی ایک ہی روش رہی۔ متبسم نگاہیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، بوٹا سا قد، چھریرا جسم، بیچ کی مانگ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے بال، پُر اطمینان چہرہ، لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہر وقت متحرک، ایک نیم اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا مرقع! میں نے انھیں ہمیشہ اسی حال میں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر سرد و گرم زمانہ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ظاہری طور سے ان کے عروج و زوال کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ وہی شیروانی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ اور وہی کشتی نما ٹوپی، اس لباس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ آزادی سے پہلے وہ سر سے پیر تک کھدر پہنتے تھے، آزادی کے کچھ دنوں بعد خود کو اس قید سے آزاد کر لیا۔ ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ بھی ہمیشہ رہا۔ ان علامات ظاہری میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ٹوپی پہننے کے معاملے میں زیادہ شدت پسند نہیں تھے۔ اکثر شعر سناتے وقت ٹوپی اتار لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک خاص قلندرانہ ادا سے ہاتھ میں ٹوپی لیے ہوئے شعر سناتے تھے۔ اس سر برہنگی کے عالم میں پتہ چلتا کہ چالیس پینتالیس کے سن تک

بالکل کالے رہنے والے بال ساٹھ کی عمر تک آتے آتے کچھ کچھ رنگ بدلنے لگے ہیں۔ یہ بھی بڑی احتیاط سے، بڑی آہستگی سے ہو رہا تھا۔ عمر بہت دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بڑا پر جوش اور والہانہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابی نظمیں سناتے وقت وہ مٹھی باندھ کے داہنا ہاتھ باغیانہ انداز سے بار بار بلند کرتے تھے۔ آخری عمر میں بغاوت پر قلندری غالب آنے لگی لیکن ہاتھ اب بھی فضا میں بار بار بلند ہوتا تھا۔ طرز خواندگی میں قدیم طرز کا ہلکا ترنم بھی ملا ہوتا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ رومان سے انقلاب تک کے تمام مراحل طے کر لیا کرتے تھے۔ خلوص، تپاک، حفظِ مراتب، آداب مجلس کا خیال یہ سب ان کی طرح داری اور وضعداری کے سنگ میل تھے۔ ایسے لوگ شاذ ہوتے جاتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو روش کے پورے نام یا ان کی صحیح عمر کا علم ہوگا۔ انھیں سب ان کے تخلص ہی سے جانتے پہچانتے تھے۔ نام جاننے کی شاید ہی کسی نے کوشش کی ہو۔ کچھ کم باسٹھ برس کی عمر پائی لیکن کاٹھی ایسی مضبوط تھی کہ دیکھنے والا چالیس پینتالیس برس کا اندازہ کرتا۔

ان کا نام شاہد عزیز تھا۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہد کو غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" بے حد پسند تھی۔ اس کے پہلے شعر سے انھوں نے خود اپنا تخلص اور اپنے بیٹے کا نام اخذ کیا۔ شعر یہ ہے:

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

روش تخلص کے بارے میں بھی ایک روایت سنی۔ روش کا وطن جوالاپور (ضلع سہارن پور، یو، پی) اپنے مناظر قدرت اور مشہور دانش گاہ گورو کل (کانگڑی) کے لئے معروف ہے۔ ابتدائی زندگی میں روش کو اس دانش گاہ سے قریبی ربط رہا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ہندی میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی اور سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا۔ گورو کل کی علمی فضا پر گھر کے ادبی ماحول نے سونے پر سہاگے کا

کام کیا اور روش سات برس کی سن سے شاعری کرنے لگے۔ والد فارسی کے عالم اور اچھے شاعر تھے۔ روش نے شروع میں انھیں سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن تخلص گوروکل کی دین ہے۔ ابھی روش تخلص و اصلاح سے بے نیاز طفلانہ شاعری ہی میں مصروف تھے کہ گوروکل والوں کو ان کے ذوق شعری کا پتہ لگ گیا اور انھوں نے ان کے لئے ایک تخلص 'رویش' جو سنسکرت میں روی (سورج) اور ایش (خدا) کا مرکب ہے تجویز کیا۔ 'رویش' اردو میں چل نہیں سکتا تھا اس لئے غالباً والد کی ہدایت پر یہ روش ہو گیا۔

اگرچہ ابتدا میں روش نے اپنے والد سے اصلاح لی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تلمیذ رحمان تھے کیوں کہ انھوں نے شاعری میں اپنی ڈگر خود بنائی۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی سلسلہ نسب چکبست و سرور و اقبال کی قومی شاعری سے جا ملتا ہے۔ بلکہ انھوں نے اس میں جوش و احسان کی طرح انقلاب کی گرمی بھی حل کر دی۔ جب انھوں نے ۱۹۱۶ء میں غزل کی شاعری شروع کی تو وہ کچھ اس طرح کے شعر کہتے تھے:

یہ میرے ضبطِ محبت کی تھی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبطِ محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک روش برابر غزلیں کہتے رہے۔ ۱۹۲۴ء سے وہ نظموں کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظم "انتظار" رسالۂ ہمایوں' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی نظمیں ملک کے متعدد رسالوں میں چھپتی رہیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء تک آتے آتے مشاعروں میں ان سے نظمیں ہی پڑھنے کی فرمائش ہونے لگی۔ وہ خود بھی بیشتر نظمیں سناتے۔ غزلیں عموماً طرحی مشاعروں، آغاز خواندگی یا مختصر نشستوں کے لئے مخصوص تھیں۔

۱۹۳۵ء کے بعد کا زمانہ نظموں کے عروج کا زمانہ ہے ۔ ۱۹۴۰ء تک نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ لکھنؤ جیسے شہر کے غزل گو، تقدم وتاخر کا خیال ترک کر کے، مشاعروں میں غزل کا دور پہلے کرا لینے کی فرمائش کرنے لگے تھے ۔ ! حصول آزادی کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور غزل پھر بزم مشاعرہ میں صدر نشین ہو گئی ۔ روش اس دور میں بیشتر غزلیں لکھنے اور پڑھنے لگے ۔ یہ ان کی غزل نگاری کا کامیاب تر دور تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے کئی غزلیں آہنگ و طرح غالب میں لکھیں اور یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا ۔

میں یہ بات بار بار دہراتا رہا ہوں کہ ہمعصر رائیں اکثر جلد بازی کی رائے ہوتی ہیں ۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کے رتبے کے ناقدوں نے روش کو خالصۃً نظم کا شاعر قرار دیا تھا اور ان کی غزل گوئی کو نسبتۃً کم مایہ ٹھہرایا تھا ۔ آج ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور لوگ انھیں صرف "محراب غزل" کی وساطت سے جانتے ہیں ۔

اکثر شاعر کچھ ایسے جہاں گرد ہوتے ہیں کہ انھیں کسی ایک شہر سے وابستہ کرنا مشکل ہے ۔ روش بھی مختلف شہروں سے متعلق رہے ہیں لیکن جوالا پور میں زیادہ قیام رہا اور وہی ان کا وطن ہے ۔ یہاں شروع شروع میں روش بانسوں کا کاروبار کرتے تھے ۔ آزادی سے پہلے انھوں نے ایک دار الاشاعت بھی قائم کیا تھا اور کوئی رسالہ بھی نکالا تھا لیکن یہ دونوں زیادہ دنوں نہ چل سکے ۔ کچھ دنوں لاہور میں علامہ تاجور کے بھی شریک کار رہے لیکن ان سے نہ نبھی اور وہاں سے بھی چلے آئے ۔ آزادی کے فوراً بعد جو اندوہناک ہنگامے ہوئے، ان کی زد میں بانسوں کا کاروبار بھی آگیا اور اس میں شک نہیں کہ کئی برس انھوں نے خاصی تکلیف لیکن بڑے صبر و استغنا سے گزارے ۔

روش کی شادی کافی کم عمری میں ہو گئی تھی لیکن بہت جلد شریک حیات نے داغ مفارقت دیا ۔ روش ان سے بے حد مانوس تھے ۔ اس ناوقت موت

کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ بہ مدتوں تاہل زندگی سے کنارہ کش رہے۔ جب سن چالیس سے متجاوز ہو گیا تو زندگی کا یہ خلا نا قابل برداشت نظر آنے لگا۔ احباب و اقارب نے بھی اصرار کیا تو انھوں نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ کسی بیوہ سے عقد کریں گے۔ اس سلسلے میں مجاز کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مجلس میں لوگوں نے روش سے شادی کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ کسی بیوہ سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ مجاز نے کہا آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد بیوی تو بیوہ ہو ہی جائے گی۔ بہرحال روش کی یہ شرط پوری نہ ہو سکی اور بالآخر سینتالیس اڑتالیس برس کے سن میں انھوں نے مراد آباد کے مولوی منظر جلیل کی صاحبزادی سعیدہ سے شادی کر لی۔ اس سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

شادی کے بعد روش کا قیام کچھ دنوں مراد آباد میں بھی رہا لیکن آبائی کاروبار سے محروم ہو کر انھیں اب فکرِ معاش ہوئی۔ مولانا آزاد جیسے گوشہ نشین کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے وزیر اطلاعات ڈاکٹر کیسکر سے تحریک کی۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا تقرر آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر اردو سپوکن ورڈ کی حیثیت سے ہو گیا۔

مولانا آزاد، روش کی ناقابلِ تسخیر قوم پروری سے بہت متاثر تھے۔ مسلم لیگ کے ہنگامہ پرور دور میں اور بعد آزادی کے ہنگاموں میں کبھی بھی روش کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ پاکستان سے کئی بار ان کو ملازمت وغیرہ کی پیش کش ہوئی لیکن جوش و نیاز کے برعکس، روش نے اپنے وطن کی خدمت کو فرضِ اولین جانا اور یہیں کی خاکِ پاک سے پیوند ہونے کو باعث سعادت سمجھا۔ ان کی قومیت "وفاداری بشرط استواری" کے معیار پر پوری اترتی تھی اور واقعتہً اصل ایمان تھی۔

۱۹۵۹ء میں جب دلی آئے تو شروع شروع میں کاکا کالیلکر کے یہاں مقیم ہوئے۔ یہاں ریحانہ بہن سے ملاقات ہوئی اور وہ ان پر بے حد شفقت کرنے

لگیں۔ ریحانہ بہن خود عالم اور علم دوست ہونے کے علاوہ روحانیت سے خاص لگاؤ رکھتی ہیں اور دلی میں بہت سے معززین ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ انھوں نے رؔوش کو اپنا بیٹا بنالیا اور کہنے لگیں کہ میں اگلے جنم میں ان کی ماں تھی۔ جب رؔوش کو سرکاری مکان مل گیا تو یہ پنڈارہ روڈ منتقل ہوگئے اور ملازمت سرکاری کے خاتمے کے بعد تک وہیں مقیم رہے۔ آخر میں وہ میرٹھ جابسے۔

میرٹھ میں مستقل قیام رہا، اس کے علاوہ لکھنؤ، بھوپال ہاؤس میں اور الہ آباد مسلم بورڈنگ ہاؤس میں بھی رؔوش ہفتوں قیام کرتے تھے۔ ان دونوں شہروں کی ادبی فضا نے ان کو اور انھوں نے وہاں کی محفلوں کو بہت کچھ دیا۔ سلسلہ فرنگی محل سے بھی ارادت رکھتے تھے۔ ان کے والد سلسلہ قادریہ رزاقیہ میں شمس العلماء مولانا عبدالحمید مرحوم فرنگی محلی کے مرید تھے اور یہ خود بھی اسی سلسلے سے منسلک تھے۔ غرض ؎

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

رؔوش کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن گھر کے علمی ماحول اور ذاتی مطالعے سے رؔوش نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کرلی۔ بالخصوص ادب و تصوف پر ان کی نظر گہری تھی۔ اور وہ تصوف کے رموز و غوامض سے خاص طور پر واقف تھے۔ معلومات ہی کی حد تک نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ صوفی مشرب تھے۔

رؔوش نے گھر پر اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر گورو کل سے ہندی اور ابتدائی سنسکرت کا علم حاصل کیا۔ کام چلانے بھر کے انگریزی سے بھی واقفیت پیدا کرلی لیکن سچے ادیب اور شاعر کی طرح وہ زندگی بھر طالب علم رہے۔ فارسی کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور شعرِ فارسی کی نوک پلک سے واقف تھے۔ فارسی کا ذوقِ شعری اور غزل فارسی کا احساسِ جمال

ان کے کلام میں پوری آب و تاب و متانت و فن کاری سے جھلکتا ہے۔

روش سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ اور لکھنؤ کے باہر مشاعروں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب سے میں نے مشاعروں میں شریک ہونا تقریباً ترک کر دیا یہ ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ لیکن جب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے تو میرا دفتر بھی قریب ہی تھا۔ اس لئے ان سے برابر بر سر راہے گاہے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی خصوصی نشستوں میں بھی ساتھ رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب وہ ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے میرٹھ جا بسے تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں یا کسی اور کام سے برابر دلی آتے رہتے تھے اور یا تو خود مجھے ملاقات کا شرف بخشتے یا کہیں نہ کہیں ملنے کا بہانہ مل جاتا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ان کی آن بان، طبعی شگفتگی، متصوفانہ سکون طبع، اور ظاہری صحت میں کوئی فرق نمایاں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاروان عمر ان سے کترا کترا کے نکل جاتا ہے۔ لیکن موت غریب الوطنی کا ماحول ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے شاہجہاں پور گئے ہوئے تھے۔ وہیں یکایک دل کا سخت دورہ پڑا اور پلک جھپکاتے یہ شاہد مجبی اور یہ یار عزیز ہم سے چھن گیا۔ ایک دور، ایک عہد، جو اب پلٹ کے آنے والا نہیں ہے، دم توڑ گیا۔ دشتِ جنوں سے سر پرخار کو تیز رکھنے کی فرمائش کیا کی جائے۔ اب شاید ہی کوئی آبلہ پا ادھر سے گذرے۔ روش کی طرح کے لوگ ایک عہد، ایک تحریک اور ایک روایت کی دین تھے اور اسی اعتبار سے دیکھے اور پرکھے جائیں گے۔

روش میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ خلوص کا مجسمہ اور وفائے بے ریا کا سراپا تھے۔ یہ کہنا شاید غلط ہو کہ وہ سب سے ایک انداز سے ملتے تھے لیکن پہلی بار جس خلوص و محبت سے ملتے تھے اسے آخر تک نبھاتے تھے۔ اس

خلوص میں گرمی بھی تھی اور خودداری بھی، وضعداری بھی تھی اور دینداری بھی، لیکن دنیا داری نہیں تھی۔ دل کے صاف تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی اسے بے تکلف اور بے تامل کہہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں زنجانی صاحب نے ایک واقعہ ان کی جوانی کا سنایا۔ ایک محفل میں اقبال کے کلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یکایک رَوش نے اقبال کو ناروا الفاظ سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی یہ دریدہ دہنی شانِ الٰہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیل ہے یہ رزاقی نہیں ہے

زنجانی صاحب اقبال کے غالی مداحوں میں تھے۔ زور آزمائی پر آمادہ ہو گئے۔ اگر رَوش کے قد کو مدنظر رکھا جائے تو نتیجہ بھی ظاہر تھا۔ اس کے بعد دونوں میں گفتگو بھی بند ہو گئی، لیکن وضعداری یہ تھی کہ رَوش الہ آباد میں بدستور زنجانی صاحب کے مہمان ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کدورت رفع ہو گئی اور خود رَوش کا یہ حال ہوا کہ وہ اقبال کے پرستاروں میں شامل ہو گئے!

اسی طرح قوم پروری کے معاملے میں وہ بے حد متشدد تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن کانگریس کے جلسوں میں وہ ضرور جاتے اور اپنی قومی نظمیں سناتے تھے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں جب کئی شاعر متعدد بہانے بنا کر جنگی ترانے، گانے اور نظمیں لکھنے لگے تھے، اس وقت بھی وہ کنارہ کش رہے اور مسلم لیگی فرقہ واریت سے بھی وہ برسرِ پیکار رہے۔ یہ پیکار فکری اور ذہنی تھی، مگر تھی غیر متزلزل۔ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش نہ ہوئی جب فرقہ واریت کی لپٹوں نے جوالاپور تک کو گھیر لیا تھا۔ ان کی قوم پروری دکھاوے سے بہت دور تھی۔ جب آزادی ملی تو بہت سے شاعر اور ادیب وزراء کے دروں کے چکر کاٹنے لگے۔ لیکن رَوش کی خودداری، فقیری اور مستی میں فرق نہیں آیا، جب آخر میں ریڈیو

کی ملازمت پائی تو بھی مولانا آزاد خود متوجہ ہوئے۔ انھیں دست سوال دراز نہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نمائشی قوم پرستوں سے رَوش کی طبیعت اکراہ کرتی تھی۔ حکومت پرستوں کو تو وہ علی الاعلان ٹوک دیا کرتے تھے۔ جب حفیظ جالندھری کو زمانۂ جنگ میں برطانوی سامراج کی حمایت کے صلے میں غالباً 'خاں صاحب' کا خطاب ملا تو رَوش نے اقبال کے شعر سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا:

رقاصِ حکومت کی معراج یہ کہتی ہے
طاؤس و رباب اوّل، اعزاز و خطاب آخر

ان کے ہم عصروں میں جوش بزرگ تر اور ساغر و احسان ہم عصر تھے اور یہ تینوں اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ جوش شاعرِ انقلاب مشہور تھے لیکن انقلاب کا نعرہ ان تینوں نے ہی اپنایا۔ ساغر کا تصورِ انقلاب، ایک محبوبہ کے تصور سے ہم آہنگ تھا، احسان خود کو مزدور شاعر کہتے تھے اور وہ انقلاب کے تخریبی عناصر کو نمایاں کرتے تھے لیکن رَوش کے یہاں کوری جذباتیت اور طمطراق الفاظ کم ہے۔ وہ انقلاب کی بھی بات کرتے ہیں اور بغاوت کی بھی لیکن وہ الفاظ کے استعمال کے معاملے میں محتاط ہیں اور بے جا جوش و خروش سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیداری ہند کے ساتھ وہ بیداری ایشیا کے بھی نقیب ہیں لیکن یہ بیداری قومی اور علاقائی بیداری ہے۔ اقبال کی بیداری مشرق کی طرح تہذیبی، فکری یا ملی بیداری نہیں ہے۔ وہ ایشیا کی بات کرتے ہوں یا ہند کی، ان کا تصورِ انقلاب آحسان دانش کے تصورِ انقلاب کی طرح بنیادی طور پر صرف خون و تباہی نہیں ہے۔ تصورِ انقلاب کے لئے اس دور میں کچھ تخریب اور جبری تبدیلی تو لازمی ہے اور رَوش بھی ایسی تعمیری تخریب کی طرف اشارے کرتے ہیں، لیکن اساسی طور پر وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے پیامی ہیں۔ وہ خواب خرگوش سے نیز بے جھوکر

یا ٹھوکریں مار کر بیدار نہیں کرتے بلکہ پیار سے جگاتے ہیں اور کبھی کبھی چلا بھی لیتے ہیں۔

ہم نے اپنی نوجوانی سے رَوش کی نظمیں سنی ہیں اور ان کی نظموں پر ہم جھومے ہیں۔ وہ اس دور کے نوجوانی کے لہجے میں ضرور بولتے تھے لیکن ان کا آہنگ بزرگوں کو بھی گوارا تھا۔ بعض اوقات تو وہ دونوں ہی کے جذبات کے ترجمان نظر آتے تھے۔ یہ غالباً فارسی ادب میں رچے بسے ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ انھوں نے قومی نظموں کے علاوہ کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ رومانی نظموں سے مراد وہ نظمیں ہیں جو حسن و عشق کے محور پر رقص کرتی تھیں ورنہ ان کی قومی نظمیں بھی رومانی تصورات سے آزاد نہیں تھیں۔ ان رومانی نظموں پر ٹیگور کا اثر (مثلاً "نہ جا") صاف جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں اپنے زمانے میں خاصی مشہور بھی ہوئیں لیکن ان کی رومانی نظموں کو وہ رتبہ نہ مل پایا جو اختر شیرانی کے حصے میں آیا۔ قومی نظمیں یقیناً ہمارے قوم پرورانہ ادب کا حسین ورثہ ہیں۔ ان میں عصری مسائل و کوائف کا ذکر آیا ہے۔ رَوش نے ان میں آفاقی عناصر ڈھونڈنے کے لئے شاعرانہ انتخاب اور خوش مذاقی سے کام لیا ہے، اس لئے یہ کافی مدت تک تازہ رہیں گی اور دوسری جذباتی تخلیقات کی طرح کسی خاص عہد کی فضا میں چمک کر بجھ نہ جائیں گی۔ یہاں ان کی نظموں پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ان کی نظمیں یکجا ملتی بھی نہیں ہیں۔ ذہن میں فوری طور سے "باردولی"، "بیداری مشرق" اور "مہاتما گاندھی" وغیرہ نظمیں آتی ہیں۔

رَوش نظموں میں شبلی، ظفر علی خاں، چکبست و سرور جہان آبادی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ جوش و شیرانی سے بھی کم عمر ہیں۔ غزلوں میں بھی ان کا شمار حسرت، صفی و فانی و جگر و فراق کے بعد کے گروہ سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی خاص استاد کے شاگرد یا کسی طرزِ خاص سے وابستہ نہیں رہے لیکن وہ بیشتر پھولوں پر لہرائے ہیں اور بعض سے کسب شہد بھی کیا ہے۔ پھر بھی نظم و

غزل دونوں ہی میدانوں میں اُن کی آواز جانی پہچانی جاتی ہے۔ جو خصوصیت انہیں
ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا رچا ہوا ذوقِ فارسی ہے۔ ویسے تو
ان کی نسل میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سبھی فارسی سے بخوبی واقف تھے لیکن
رَوش تراکیب فارسی کے استعمال اور تراش و تخلیق میں زیادہ کوشاں رہتے تھے۔
ان کے یہاں زبان و بیان کا یہ فارسی انداز ارادی اور اسی لئے زیادہ نمایاں ہے
کہیں تو وہ "بربطِ بے نغمہ" اور "ساغرِ بے بادہ" جیسی ترکیبیں تراش لیتے ہیں۔ اور
کہیں "سرمۂ بینائش" اور "بعد ہزار انواع" جیسی ترکیبوں کو بھی غزل کے لئے روا
رکھتے ہیں۔ ایسے مقامات شاذ ہی مگر ہیں۔ رَوش کا فن ہمہ جہاتی نہیں ہے اور فکری
عنصر بھی ان کے یہاں دبا دبا سا ہے۔ لیکن گہرے متصوفانہ اندازِ نظر (تصوف نہیں)
اور تغزل کی متوازن رَو کی بدولت اُن کی غزلوں تک میں ایک فکری ماحول ضرور
ملتا ہے جو جگر و ساغر سے زیادہ نمایاں ہے۔

اُن کے یہاں خمریات کے بھی تمام لوازم ملتے ہیں۔ میکدہ، مینا، جام و سبو،
خمار، تشنگی الخ (بفیضِ غالب) رہبر اور بزم کا ماحول بھی شمع، ہمنشیں، پروانہ وغیرہ
سے تعمیر ہوتا ہے وہ تلاطم و باد و ساحل سے بھی باتیں کرتے ہیں اور منزل و سفر
جادہ کی بھی۔ بہار و چمن بھی ہے منصور و طور و موسیٰ بھی ہے۔ لیلا و سلما بھی۔
سینکڑوں برس سے ان مضامین کے گرد رقاصۂ غزل ناچتی رہی ہے لیکن رَوش
ان فرسودہ مضامین میں بھی اپنی فن کاری سے ایک تازگی پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ
بزم و انجمن سے زیادہ خلوت و تنہائی کے شاعر ہیں۔ اُن کا عشق ایک "ربطِ پنہاں"
ہے۔ اُن کا "شوقِ فراواں" ہر لحظہ فزوں بھی ہوتا ہے، اس میں "گلہ و شکایت"
"حرف و حکایت" بھی ہے اور عشرت کیف و طرب کے ساتھ اشک و غم و درد
بھی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت منزلِ احساس فراموش میں زیادہ ابھرتی ہے
انھیں حسرتِ آغوش بھی ہے لیکن وہ بیگانہ نگاہی پر بھی جان چھڑک سکتے ہیں۔
وہ "آئینِ حجاب" کے پرستار ہیں۔ "آوارگیٔ غربت" میں بھی لذت محسوس کرتے

ہیں۔ اکثر "بیتابِ گزارش" (ترکیب کی غرابت پر نہ جائیے) رہتے ہیں اور تماشائے بیتابیِ دل کے مزے لیتے ہیں۔ جب سطحِ عشق بلند ہوتی ہے تو "زندگی حجابِ رخِ امکاں" بن جاتی ہے اور وہ "رسمِ اظہار" سے بیگانہ ہوکر "نالۂ خاموش" سے بھی کام لینے لگتے ہیں۔ وہ نظارہ کی مسرتوں سے بھی آشنا ہیں، لیکن یہ نظارہ انھیں حیرت و حیرانی کی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ راہِ تصوف کے جادوں سے آگاہ ہیں لیکن اُن کا اندازِ قیام و سفر ذہنی ہے۔

وہ اکثر تضادات سے بھی کام لیتے ہیں۔ جیسے صبح و شام، طرب و غم، دیر و حرم، شوق و تغافل، سکوت و گفتگو، سوال و جواب، وفا و جفا، اور کبھی تسلسل کلام سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن تازگی و شگفتگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے اشعار میں سیاسی اور سماجی رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ ابتدا میں رَوِش پر شبلی و اقبال کا اثر نظر آجاتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ارادی طور پر "بطرزِ غالب" لکھنے لگے تھے۔ کئی غزلیں غالب کی طرحوں میں لکھی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا کرلی ہے۔

رَوِش موجودہ دور کے ممتاز غزل گو تھے اور صادق لہجہ نظم گو۔ اُن کے کلام کا بہت سا حصہ غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُسے یکجا کرلیا جائے۔ غزلیں تو "محرابِ غزل" کی بدولت پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن نظمیں صرف حافظوں یا اخبارات و رسائل کے صفحات میں محفوظ رہ گئی ہیں ضرورت ہے کہ انھیں فوراً یکجا کرلیا جائے۔ یہاں کوئی انتخاب منظور نہیں ہے۔ لیکن چند اشعارِ غزل پیش ہیں:

فریبِ آرزو کی انتہا ہے — کسی افسردہ دل کا مسکرانا

گمانِ بادۂ عشرت مرے سبو پہ نہ کر — ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا

حریفِ عیش نہیں ہوں مگر خوشی یہ ہے — تری نگاہ سے پنہاں رہا ملال مرا

ہاں زندگی ایک پیغامِ لغزش — جینا پڑے گا کب تک سنبھل کر

خداشناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم — کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار

ہائے اب ان بستیوں کا ذکر ہی کیا ہم نشیں
جو ابھی بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہو گئیں

سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہو گا
سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

روش کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں نہیں ملتیں لیکن مراب غزل میں غزل کے بارے میں جو نظم یا غزل ہے اُس میں کچھ تسامحات نظر آئے۔ مثلاً یہ اشعار

دیکھتا کون رُخِ شاہدِ معنیٰ کی بہار
گر یہ پیراہنِ خوش زیب نہ پہنائے غزل

ہوش رہتا کسے اس دور میں حق گوئی کا
اگر افسانۂ منصور نہ دہرائے غزل

لب کشا کیا کوئی ہوتا اگر اُس محفل میں
ترجمانِ دلِ خاموش نہ بن جائے غزل

آتشِ وعظ و خطابت کا بھرم کیا کھلتا
تختۂ دار سے گر پھول نہ برسائے غزل

پہلے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کا قوافی سے ربط نہیں۔ اگر علی الترتیب یوں ہوتا تو یہ عیب جاتا رہتا (۱) دیکھے پھر کون (۲) پھر کسے ہوش ہو (۳) لب کشا کیسے کوئی ہو (۴) کیسے کھلے ۔ اِن معمولی لغزشوں سے جو معدوم کی حد تک شاذ ہیں۔ روش کی عظمت شاعری میں فرق نہیں آتا۔ وہ اس دور کے صفِ اوّل کے ممتاز شاعر ہیں اور ہمارے ادب میں ان کے لئے مستقل جگہ محفوظ ہے۔

●

حضرت روش صدیقی اردو کے ان چند ممتاز شاعروں میں تھے جو تقریباً چالیس سال سے ہمارے مشاعروں، ہمارے ادبی رسالوں اور ہماری ادبی اور شعری نشستوں کا ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے۔ حضرت روش نے اختر شیرانی کے ساتھ ہی اپنی رومانی نظموں کی بنیاد پر شہرت حاصل کی۔ ان کی نظموں میں ہماری کلاسیکل شاعری کا وزن و وقار تھا اور ہمارے دور کے خیالات ومحسوسات اور تحریک آزادی اور وطن پرستی کے جذبات کا عکس تھا۔ گاندھی جی کی شہادت پر ان کی نظم ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ روش صدیقی نے اِدھر نظموں کے علاوہ غزلوں پر بھی توجہ کی تھی .... ان کے پڑھنے کے انداز میں ایک خاص جوش تھا۔ وہ بڑے وضعدار آدمی تھے اور حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا....

پروفیسر آل احمد سرور (ہماری زبان، یکم فروری ۱۹۷۱ء)

انور صدیقی

۴

روش صاحب کے بارے میں سوچتا ہوں تو ذہن میں ایک متحرک، مضطرب اور مختصر سے شخص کی تصویر ابھرتی ہے۔ شخص کی یہ تصویر شخصیت کی بھی تصویر ہے اور شاعری کی بھی۔ کبھی کبھی مجھے انھیں دیکھ کر کچھ یوں محسوس ہوا ہے جیسے ان کے شخصی وجود اور شعری کردار میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ ان کی زندگی کی امید پروری، حیات آگینی، الوہی معصومیت، معصوم آسان گیری یا مقدس ماورائیت، مہذب سرشاری، غیر نمائشی سلیقہ مندی وغیرہ اُن کی شاعری کے بھی اتنے ہی اہم اجزا رہیں جتنے کہ ان کی زندگی کے۔

میرے ذہن پر روش صاحب کی شاعری کا اوّلین نقش اُن کی رومانی شاعری کا ہے۔ میں نے بچپن میں ان کی نظم "مرے سرِ ناز ابھی نہ جا" پڑھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس نظم نے مجھ پر ایک طرح کی وجد آفریں کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس رومانی نظم میں کتنی طہارت اور تازگی تھی اور کتنی بسیط سحر آفرینی تھی۔ اس کے بعد میں نے ان کی کتنی ہی رومانی اور غیر رومانی نظمیں مختلف رسالوں میں پڑھیں اور متاثر ہوا۔ جسم کی ایسی غیر جسمانی شاعری کم از کم اس دور میں میری نظر سے نہیں گزری۔ روش اور ان کے ہم عصروں کی رومانی شاعری دراصل اردو کی اصلاحی اور مقصدی شاعری کے خلاف ایک طرح کا ردِعمل تھی۔

اس کے علاوہ بے رحم صداقتوں کے خلاف انسانی ذہن ہمیشہ باطنی یا تخئیلی قلعہ بندی کرتا رہتا ہے۔ رومانی شاعری کی ماورائیت تخئیل پسندی، داخلیت، فطرت پرستی، خارجی زندگی کی بدصورتیوں کے مقابلے میں ذاتی نادیدہ گلستانوں کی تخلیق کے عزم کی آئینہ داری کرتی ہے۔ غیرملکی غلامی، اقتصادی زبوں حالی اور سیاسی پراگندگی کے مقابلے میں یا مقابلہ نہ کرسکنے کی صورت میں، رومانی شاعری کا اردو میں فروغ پانا، سمجھ میں آتا ہے۔ رومانی شاعر کی طرح رومانی شاعری کی بھی عمر کم ہوتی ہے۔ زیادہ تر تو شاعر کی زندگی ہی میں رومانی شاعری دم توڑ دیتی ہے۔ آشوب آگہی انتقام لے لیتا ہے یا یوں کہئے کہ ذہنی اور جذباتی عمر جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، رومانیت کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو بعد کی شاعری رومانی شاعری کی تردید بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ رومانیت ہمیشہ اور ہر حال میں صرف ایک جذباتی رویہ نہیں ہوتی، ایک ذہنی رویہ، فلسفہ اور اندازِ فکر بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ تمام عمر طرح طرح سے شاعری میں آئینہ کاری کرتی رہتی ہے۔ اقبال اس لحاظ سے تمام عمر رومانی رہے۔ آروش کی رومانیت کی بھی کم و بیش یہی نوعیت ہے۔ آروش کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی اس میں صحت مند تصوف کی اقدار رچی بسی ہوئی تھیں۔ گروکل کانگڑی میں تعلیم کے دوران انھیں ہندو فکر و فلسفے کی زندہ آگہی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ بعد میں بھی وہ مسلم تصوف سے خاصے متاثر ہوئے۔ ان کی رومانی تخئیل کو انھیں فکری اور جذباتی ماخذوں سے بال و پر ملے۔ ہندو فکر و فلسفے میں روح اور جسم کی ثنویت پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آروش کی رومانی شاعری میں ہمیں ماورائی ٹھنڈک زیادہ محسوس ہوتی ہے اور جسم کی گرمی کم۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے جسم کے مطالبوں کو ترفع کی منزل تک پہنچا دیا ہو اور جس کیفیت کا اظہار کیا ہو وہ اپنی اولین آلائشوں اور تناقضات سے پاک ہو کر ایک مقدس احساس بن گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی رومانی شاعری میں کسی نہ کسی طرح کی، کسی نہ کسی سطح پر کشمکش کا احساس

ہوتا۔ اچھی اور بڑی شاعری ٹن شن یا کشمکش کی پیداوار ہوتی ہے۔ رَوِش کی نظم "شاہدِ معصوم" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

محفل آرائے دنیا تو اور میں ننگِ وفا
دل مرا تاریک ہے تو بحرِ انوار و ضیا
رہرو منزل ہوں میں اور تو ہے گرد و دل آشنا
نُور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جائے شاہدِ معصوم مجھکو بھول جا

فطرتِ رنگیں کو تو اے دل رُبا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو
آہ! ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو
اور تیرے دل کا ہر محبوب اک غم آشنا
بھول جائے شاہدِ معصوم مجھکو بھول جا

"بحرِ انوار و ضیا" اور "گرد و دل آشنا" جیسی تراکیب اور اشعار کی باطنی فضا شاعر کے ذہن کی ماورائیت کی غمازی کرتی ہے۔ طہارتِ فکر رَوِش کی رومانی غیر رومانی اور نیم رومانی نظموں میں طرح طرح سے نمایاں ہوتی ہے۔ غزلوں کے اشعار کی فضا بھی ان کے پاصفا ذہن کی تابانیوں سے معمور ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے فکر و احساس کی کسی بھی منزل پر غالب کی زبان میں "آلائشِ پندارِ وجود" سے اپنی شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا ہو۔ زمین سے بلند ہو کر حیات و کائنات کی سیر، رَوِش کی رومانی افتادِ طبع کی ایک خصوصیت ہے جسے آج کی سماجی تنقید پسند کرے یا نہ کرے۔ بہرحال اس نے ہمیں ایک نئی حسی فضا سے آشنا کیا۔ خود میں جب بھی اُن سے ملا ہوں تو مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے گویا ایک معصوم فرشتہ غلطی سے اُس تاریک سیارے میں آگیا ہو جسے ہم عرفِ عام میں دنیا کہتے ہیں۔ ان کا وہ اضطراب جو گفتگو کی تیزی اور جسم کی غیر اضطراری حرکت

سے نمایاں ہوتا تھا، اس بات کا اظہار تھا کہ ان کا سارا وجود ایک طرح کی مقدس بے اطمینانی کی گرفت میں ہو۔ ایک طرح کی الوہی بیزاری، سارے مادّی وجود سے، ان کی شخصیت کا جز معلوم ہوتی تھی۔

یہ ان کی رومانیت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں خبر کے مقابلے میں بے خبری، علم کے مقابلے میں حیرت، عقل کے مقابلے میں عشق، سروسامان کے مقابلے میں بے سروسامانی اور گریز کے مقابلے میں سپردگی کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اقدار تصوف کی راہ سے بھی ان کی شاعری میں داخل ہوئی تھیں۔ اکثر رومانیت پر تصوف کا اور تصوف پر رومانیت کا گمان گزرتا ہے اور یوں بھی مغرب میں رومانیت کا ظہور عقلیت اور عقلیت پسند رویوں کے خلاف احتجاج کا رہین منت ہے۔ کم وبیش مشرق میں بھی تصوف مذہب کی خارجی تعبیر، فقیہانہ خشونت اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے روپ میں ابھرا۔ مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اردو کی رومانی شاعری میں اقبال کو چھوڑ کر کسی کے یہاں بھی تصوف کی گیرائی اور تہ داری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اردو کی رومانی شاعری فکری اعتبار سے انتہائی تنگ دامن ہے۔ اس میں صرف عنفوانِ شباب کی رنگین و رعنا جذباتیت ہے مگر اس میں جذبات کی وہ پیچیدگی نہیں ہے جو شاعری کو ہمہ گیری عطا کرتی ہے۔ اردو کی رومانی شاعری اتنی شفاف اور سادہ ہے کہ وہ ایک خاص ذہنی عمر تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد وہ جذبات کی خارش سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔ رَوِش کی رومانی شاعری نہ تو سطحی ہے اور نہ ہی اس میں اثر انگیزی کی کمی ہے۔ ان کے عقائد نے اس میں ایک مخصوص قسم کی تب وتاب پیدا کر دی ہے۔

رَوِش کی وطنی اور فکری نظموں کو میں رومانیت کی تردید نہیں اس کی توسیع سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ان کے شعری لہجے، مزاج اور تمثالوں کی فضا کو دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ وہ رسم ورہِ رومانیاں سے ہٹے نہیں بلکہ اس سے ایک نئے انداز

سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ان کی وطنی نظموں میں آزادی کا تصور خاصا رومانی اور قدرے متصوفانہ ہے۔

رومانیت کا حسن بالعموم احساس کے ابہام سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی رومانیت کی توانائی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ توانائی ان معنوں میں کہ یہ ابہام شعری کارناموں کو لبیط رمزیت بخشتا ہے اور معنی کی تہوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ کمزوری اس معنی میں کہ یہ پراگندگی فکر کا غماز ہوتا ہے اور فنی ارتکاز کی کمی یا عدم کا اظہار۔

رومانی مسلک میں عینیت یا مثالیت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آروش کی نظم 'روشنی' اس مسلک کی انتہائی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم کے لہجے پر غور کیجئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ کس طرح رومانیت اور ترقی پسندانہ اسالیب ایک دوسرے سے ہم آمیز ہو گئے ہیں اور جس کے نتیجے میں ایک طرح کی رومانی انقلابیت پیدا ہوئی ہے:

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغِ امید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا
جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے
ہاں وہی دور وہی عہدِ مسرت بنیاد
جس کو روحِ غمِ پنہاں نے کیا ہے تعمیر
وہی عالم وہی مسجودِ جبینِ ایام
وہی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وہی جنت وہی کیفِ ابدی کا پیغام
چشمِ آدم میں جو تھا صبحِ ازل سے آباد
مسکراتا ہے وہی خواب بہ شکلِ تعبیر

خوش ہوں اے دوست کہ وہ دورِ بہار آتا ہے
جس کو نزدیکِ خزاں کر نہ سکے گا انساں
شکلِ نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موجِ بے گانہ وشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیریت آ کے ہمیں منھ نہ دکھائے گی کبھی
اب زمیں پر درِ یزداں سے وہ پیار آتا ہے
کہ جسے نذرِ زیاں کر نہ سکے گا انساں

یہ نظم روش کی اچھی نظموں میں ہے۔ اس نظم میں ذہنی ہمدردی اور آزادیٔ انسان کا جو تصور ہے اور اس تصور کی جن الفاظ میں نقش گری کی گئی ہے اس کے رومانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ حال سے بیزاری اور ماضی اور مستقبل سے امید کی وابستگی رومانی مزاج کا خاصہ رہی ہے۔ یہاں مستقبل اپنے دامن میں جس دور کو چھپائے ہوئے ہے وہ گردوں کے ستاروں نے پالا ہے، کہکشاں نے اسے راز کی طرح چھپایا ہے۔ فرشتوں نے اسے انسانوں کی دسترس سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خواب چشمِ آدم میں روزِ ازل سے مسکراتا رہا ہے۔ وہ خواب تعبیر کی منزل تک پہنچ رہا ہے اور ایک ایسے دور کی بشارت دی جا رہی ہے جو بہارِ مجسم ہوگا، اسے کوئی نزدیکِ خزاں نہ کر سکے گا۔ نفرت ایک خواب فراموش ہو چکی ہو گی، موجِ بے گانگی کو سر اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی اس نظم میں ایک نئے دور کی جو تخئیل نقش گری کی گئی ہے، وہ اپنے حسن کے باوجود کچھ مابعد الطبیعی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نظم کی رجائیت خواب پرور سہی، مگر حقیقت کی تابانیوں سے محروم ہے یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کی رومانیت میں جو انسان نوازی ہے وہ ہمیں مغربی رومانی فلسفے کی یاد دلاتی ہے جو انقلابِ فرانس کے بعد ابھرا تھا اور جس نے یورپ کی رومانی شاعری کو انسانی عظمت کا رزمیہ بنا دیا تھا۔ انسانی عظمت کا یہی ادعا ہمیں روش کی رومانی شاعری

متاعِ عزیز سمجھ کر محفوظ رکھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہی شریف اور غیر جارحانہ مسلکِ انسانیت نوازی ان کی بعض اچھی غزلوں کی جان ہے۔ مغرب میں انسانیت نوازی کا مسلک نشاۃ الثانیہ کا رہینِ منت ہے جب وہ زندگی ختم ہوئی جو خدا مرکز GOD - CENTRED تھی اور ایک ایسی زندگی کا تصور عام ہوا جس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ مغربی مسلکِ انسانیت نوازی در اصل غیر خدا پرستانہ ہے۔ رَوش نے کس مسلک کو قبول کیا ہے، اس کا پتہ لگانا مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ رَوش کی زندگی میں مذہبیت اور خدا پرستی کے رنگ بہت نمایاں تھے لہٰذا ان کے بارے میں یہ سوچنا کہ انھوں نے مغربی انسانیت نوازی کے ملحدانہ مسلک کو قبول کیا ہوگا، غلط ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں اور غزلوں کی داخلی فضا اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ان کا وزن یا خواب عرفان مذہبی اور متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ غالباً ان کے تصورِ انسان میں تصوّف کا عمل دخل زیادہ ہے۔ تصوف کے بعض مکاتیبِ فکر ایسے بھی ہیں جو انسان کو کائناتِ اصغر کا درجہ دیتے ہیں۔ رَوش کسی ایسے ہی مکتبۂ فکر سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ وہ باشعور شاعر تھے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے جوؔش اور ترقی پسند شعراء سے متاثر ہو کر فیشن کے طور پر انسانی عظمت کے گیت گانے شروع کر دئے تھے، کچھ مناسب نہیں ہے۔ میں اسے بھی ان کی روحانیت پر محمول کرتا ہوں۔ 'عروجِ آدم' کے تصور کو بنیاد بنا کر انھوں نے ایک غزل کہی اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

محبت کی جہاں بانی کے دن ہیں
زمیں پر خلد سامانی کے دن ہیں
یہ ہے دورِ جلالِ ابنِ آدم
نہ سلطانی نہ خاقانی کے دن ہیں
جو ہیں اپنی جگہ خورشید بنیاد

34068

اب ان ذرّوں کی تابانی کے دن ہیں
ہر اک زنجیر ہے اب پا شکستہ
ہر اک زنداں کی ویرانی کے دن ہیں
زوال آمادہ ہے تعمیرِ اوہام
کمالِ فکرِ انسانی کے دن ہیں

مشرق یا ایشیا کی بیداری کے موضوع پر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے رومانی ہیں۔ ایشیا کی بیداری ان کے لئے تمام تر تہذیبی ورثے کی بھی بیداری ہے۔ یہ بیداری، بیداری سے زیادہ بازیافت ہے۔ نیا اور بیدار ایشیا 'قدامت زندگی کے سایہ' میں بدل رہا ہے۔ اس میں شوکت پاستاں بھی ہے اور جمالِ مستقبل بھی۔ ماضی کی زبوں حالی کا احساس بھی ہے اور حال کی تبدیلیوں کا شعور بھی۔ ایشیا ان کے لئے صرف جغرافیائی خطہ ہی نہیں بلکہ ایک شعلہ آفریں جذبہ بھی ہے۔ ان کی ایشیا سے وابستگی جذباتی ہے اور جذبہ کا سارا وفور رکھتی ہے اسی لئے اس میں ایک خوشگوار رومانیت ہے۔ ایک زمانے میں اردو کے ترقی پسند شعراء کے لئے ایشیا کی بیداری سامراجی طاقتوں کی شکست کی علامت بن گئی تھی اور ایشیا کو موضوع بنا کر سامراج کو شب وستم کا ہدف بنایا گیا تھا اور اس طرح خطیبانہ اور غیر شاعرانہ لہجے میں اس بیداری کے گیت گائے گئے تھے۔ ان شعراء کو 'بے خودی' میں انداز گفتار پر قابو نہ رہا اور انھوں نے اس طرح کے شعر کہے:

اب سے ہوگا ایشیا پر ایشیا والوں کا راج
دستِ محنت کو ملے گا دستِ محنت سے خراج
زندگی بدلی ہے، بدلا ہے زمانے کا مزاج
چھوڑ دیں گے ہم یہ آنکھیں ہم کو مت آنکھیں دکھاؤ
——— ایشیا سے بھاگ جاؤ

اسی موضوع پر روش صدیقی کی نظم دیکھئے کہ کس طرح ان کے رومانی انداز نظر نے ان کی نظم کو شعری تجربے کا جمال عطا کیا ہے اس سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ موضوع کے عقلی ادراک اور جذباتی ادراک میں کیا فرق ہے۔ شعر کی شریعت میں جو کچھ جذبے کی وساطت سے نہ آسکے کفر ہے:

حسین خوابوں کی روشنی میں شب خیالات سے گذر کر
جہاں جہاں تھا گمان فردوس اُن حجابات سے گذر کر
غم وطن اور غم زمانہ کے تلخ لمحات سے گذر کر
غم بشر جاگ اٹھا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

یہ ایشیا کی تڑپ نہیں ہے حیات گر کر سنبھل رہی ہے
ضمیر انساں کی ہر صداقت نئے تصور میں ڈھل رہی ہے
قدامت زندگی کے سائے میں زندگی خود بدل رہی ہے
حباب سا اُٹھ رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

نشاط پرویز سرنگوں ہے، ملال فرہاد جاگ اٹھا ہے
غیور محکوم جاگ اٹھے ہیں، جہان آزاد جاگ اٹھا ہے
وہ صبح کی خلوت زرافشاں میں اک شفق زاد جاگ اٹھا ہے
یہ قاصد ارتقا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ روش اپنی شاعری کے ہر دور میں رومانی شاعر رہے ہیں یہ ضرور ہے کہ ان کی رومانیت کی حدیں برابر وسیع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی رومانیت میں نئے رومانی رنگ شامل ہوتے گئے۔ پہلے یہ رومانیت "کہر آلود چاندنی" کی فضا لئے ہوئے تھی۔ بعد میں یہ چاندنی کبھی تاریک ہوئی

اور کبھی روشن۔ ان کی شاعری ذات کی توسیع کی بھی داستان ہے اور ذات میں توسیع کی بھی۔ وہ اپنے اندر پھیلے اور گہرے ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کا شعری ارتقاء داخلی ہے۔ ارتقائی اعتبار سے ان کی شاعری تین ادبی اثرات کے دور میں پروان چڑھی۔ ان کی شاعری کی ابتدا ایسے دور میں ہوئی جب حفیظ، اختر اور ساغر کے رومانی گیت فضا میں گونج رہے تھے اور اقبال کی شاعری عام ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس رومانیت کے خلاف ردعمل کے طور پر ترقی پسند شاعری نے اپنا پرچم بلند کیا اور اس نے شاعری سے سماجی اور تہذیبی آگہی کا مطالبہ کیا۔ ان کی شاعری کے آخری دور میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری نے تین ادبی نسلوں کے درمیان اپنے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ پہلے دور یا پہلی ادبی نسل کے اثرات نے ان کے تشکیل پذیر ذہن پر کئی گہرے نقوش ثبت کئے۔ ترقی پسندی نے ان کے لہجے کو تھوڑا سا متاثر کیا اور ان کے موضوعاتِ شعری میں اضافہ کیا۔ جدیدیت ان کے لئے ایک ادبی نزاع سے زیادہ کچھ نہ تھی اس وجہ سے اس کے تخلیقی اثرات ان کے یہاں کسی طور پر بھی تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ اپنے شعری اسالیب اور لہجے کی حد تک وہ ادبی اثرات ضرور قبول کرتے رہے مگر بنیادی طور پر ان کا اندازِ فکر یا ان کی حسیت رومانی رہی۔ ان کی شاعری کسی زبردست معنوی تبدیلی کی نشاندہی نہیں کرتی۔

ایک عرصے سے ان کی توجہ غزل کی طرف زیادہ ہوگئی تھی۔ غزلیں انھوں نے اپنی نظم نگاری کے دور میں بھی کہی تھیں لیکن نظم ان کی تخلیقی ترجمانی زیادہ کرتی ہے۔ غزل انتہائی انفرادیت کش صنف سخن بھی ہے اور انفرادیت ساز صنف سخن بھی۔ یہاں اچھے سے اچھا شاعر بھی آوازِ گشت بن کر رہ جاتا ہے۔ روش نے بہت سی کامیاب غزلیں کہی ہیں مگر اس کے باوجود وہ اقبال، اصغر اور غالب کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر رچی ہوئی فارسیت،

ترصیع اور شادابی کے باوجود وہ انفرادیت نہیں حاصل کر سکے جو انھوں نے نظم کے میدان میں حاصل کر لی تھی۔ ان کی غزلیں پڑھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ صرف اُن جذباتی مرحلوں پر کامیاب ہیں جہاں تصوّف اور رومانیت کے موضوعات شعری اظہار کی حدود میں آ گئے ہیں۔ اب تک ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آ سکا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی نظموں کا کوئی نمائندہ مجموعہ شائع کیا جائے۔ تاکہ مرحوم کے ادبی مرتبہ و مقام کے تعین میں آسانی ہو۔ ان کی زندگی میں ایک بدنصیبی یہ تھی کہ رومانیوں نے انھیں فکری وسعت کی وجہ سے کم رومانی سمجھا اور ترقی پسندوں نے انھیں صرف رومانی اور صوفی قرار دیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی شعری حیثیت کا حقیقت پسندانہ تعین کیا جائے۔ اب موت نے انھیں تحریک پسندوں کے ادبی تعصبات کی زد سے بہت دور کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی موت ہی ان کی ادبی زندگی کی ضامن بن جائے۔

●

روشؔ صدیقی کی موت اردو دنیا کے لئے واقعی ایک سانحہ ہے۔ وہ بڑی ہی محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ اردو شاعری میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور وہ موجودہ شعراء میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری قدیم اور جدید کا سنگم تھی۔ جہاں انھوں نے اپنے شعر و ادب میں قدیم ادب کی روح کو برقرار رکھا اور اس کے جملہ تقاضوں کو پورا کیا، وہاں جدید مثبت رجحانوں کو اپنانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ندرت خیال کا اپنی شاعری میں انھوں نے ہمیشہ ثبوت دیا لیکن طہارت فکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ سچے مذہبی آدمی تھے اور تمام سچے مذہبی آدمیوں کی طرح وسیع القلب۔ ہندوستان کی دھرتی اور اس کی روایات کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا، ان کی نظمیں وطن پرستی کے صالح اور مثبت رجحانات کی آئینہ دار ہیں، جو لوگ اردو ادب پر غیر ملکی ہونے کا الزام لگاتے ہیں ان کے لیے یہ نظمیں سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتی ہیں۔ گاندھی جی کی موت پر ان کی جو نظم ہے، اس پر صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا موجودہ ادب مجموعی طور پر ناز کر سکتا ہے اور گنگا پر ان کی نظم گورو کل کانگڑی کے نصاب میں شامل ہے۔

روشؔ نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ غزل کا صحیح مقام عشق اور تصوف کے بین بین ہے اور روشؔ اسی مقام سے غزل کہتے تھے۔ غزل کے بعض نکتہ چیں غزل گویوں پر ریزہ گوئی کا الزام لگاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نظم جیسی مربوط صنف سخن ان کے بس میں نہیں۔ لیکن روشؔ کو نظم گوئی میں بھی کمال حاصل تھا، اتنا کمال کہ بعض ناقد انہیں نظم گو شاعر کہنے پر ہی مصر ہیں۔

گوپال متل

(تحریک، فروری ۱۹۷۱ء)

مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی

۵

رؔوش صدیقی کے اچانک انتقال کی خبر سنتے ہی حافظے میں ان سے پہلی ملاقات کے نقوش ابھر آئے جس کو اب ۳۴ سال ہو گئے ہیں اور آخری ملاقات تو ابھی ۲۸ دن قبل اتر پردیش کے "اردو بورڈ" کے جلسے میں ہوئی تھی جو ۲۵ ر دسمبر کو کونسل ہاؤس (لکھنؤ) کے کمرہ نمبر ۸۰ میں وزیر اعلیٰ شری ٹی این سنگھ کی صدارت میں ہوا تھا، رؔوش صاحب بھی اس کے ممبر تھے اور میں بھی۔ انھوں نے ایک لاجواب بات کہہ کر وزیر اعلیٰ کو گویا خاموش یا لاجواب کر دیا تھا، ان کی بات اسی لئے یاد رہ گئی حالانکہ اس جلسے میں پنڈت آنند نرائن ملاؔ (سابق ایم پی) پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر کل ہند انجمن ترقی اردو (ہند) اور پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی وغیرہ نے کئی ٹھوس تجاویز پیش کی تھیں ملا صاحب نے ریاستی حکومت کی اردو دشمنی اور اس کے افسران کی اردو کے ساتھ عداوت پر ایسے کھلے اور بے لاگ انداز میں اظہار رائے کیا تھا کہ فراموش نہیں ہو سکتا، مگر روش صاحب نے بالکل دوسرے ہی ڈھنگ سے اپنی بات کہی۔ وہ اردو فارسی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے اسی لئے وہ اس انداز میں بات کہہ گئے۔

شری ٹی۔ این سنگھ نے جو نئے نئے وزیر اعلیٰ ہوئے تھے اور باعتبار

عہدہ اردو بورڈ کے جلسے کی پہلی بار صدارت کر رہے تھے اردو سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا "میرے خیال میں اردو زبان ختم نہیں ہوسکتی ہے اس میں کچھ روحانی طاقت ہے کہ باوجود مخالفت کے وہ بڑھتی جارہی ہے۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرا تعلق ایک اردو اخبار سے رہ چکا ہے، میں انگریزی روزنامہ 'نیشنل ہرالڈ' نکال رہا تھا کہ ایک دن رفیع بھائی نے (سابق مرکزی وزیر غذا مرحوم رفیع احمد صاحب قدوائی نے) مجھ سے کہا کہ ایک اردو روزنامہ اخبار بھی نکالو، جس کا نام 'قومی آواز' رکھا گیا تھا میں حیران کہ انگریزی اخبار رہی کے مصارف برداشت سے زیادہ ہورہے تھے۔ اس زمانے میں (۱۹۴۵ء میں) اردو اخبار کے مصارف کیسے پورے ہوں گے، بہرحال ان کے حکم کی تعمیل میں، میں نے قومی آواز، نکالا اور مجھے اس وقت واقعی اچنبھا ہوا جبکہ بہت جلد قومی آواز اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔"

ملا صاحب نے بڑی تلخی سے اس کا جواب دیا کہ "ریاستی حکومت کی طرف سے حق تلفیاں ہونے اور سرکاری افسران کے اردو کے مسلمہ حقوق کو نظرانداز کرنے کے باوجود اردو جو مٹ نہیں رہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں اتنی سکت تھی کہ اب تک زندہ رہی۔"

مگر روش صاحب نے (جن کو "مرحوم" لکھنے کا جی نہیں چاہتا) وزیر اعلیٰ کو مخاطب کرکے کہا "آپ نے جو اردو کی روحانی طاقت کا حوالہ دیا ہے تو اس سلسلے میں عرض کرنا ہے کہ ہندوستان کی قدیم اعتقادی روایت کے مطابق جس "آتما" (روح) کا کوئی "شریر" (جسم) نہ ہو وہ ہمیشہ اذیت میں رہتی ہے۔" اس طرح انھوں نے اس مطالبے کو دہرایا کہ اردو کو جو اترپردیش کی دوسری بڑی زبان ہے ریاست میں قانونی حقوق ملنا چاہئیں۔

مرحوم، ہندی اور سنسکرت اچھی جانتے تھے اور اس زمانے میں جب مسلمانوں میں ایک ہی آدھ ہندی اور سنسکرت پڑھا ملتا تھا وہ ہندی کے رسائل

اور ہفتہ وار بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے، تقسیم ہند سے قبل، اور دوسری عالم گیر جنگ کے زمانے میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اردو، انگریزی اور ہندی میں بمبئی سے ہفتہ وار اخبار نکالتی تھی جو جنگ کو "عوامی جنگ" قرار دینے کے بعد ان اخبارات کے ذریعہ اس نقطۂ نظر کی تبلیغ کر رہی تھی۔ ہم لوگ اردو اخبار "قومی جنگ" پڑھتے تھے اور ترّوش صاحب ہندی اخبار۔ اس کے باوجود ان کی اردو شاعری کا خصوصی پہلو، فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت اور فارسی تراکیب کا غیر معمولی استعمال تھا اور یہ خصوصی پہلو، ان کی شاعری کے ابتدائی دور سے آخر تک بجنسہ برقرار رہا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے اس پہلو کو ذہن نشین کر چکا ہے تو وہ ترّوش صاحب کا کلام سنتے ہی (اگرچہ اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ ہو) جان جائے گا کہ یہ ترّوش صاحب کا کلام ہے۔ ان کے کلام کا یہ پہلو اس حد تک خصوصی ہو چکا تھا کہ ہر دلعزیز اور مقبول شاعر تھے، اور کامیاب اور میدان مارنے والے بھی۔

سب سے پہلے ایک فاتح مشاعرہ کی حیثیت ہی سے میں نے جانا پہچانا تھا، لکھنؤ میں ایک آل انڈیا نمائش ۳۷-۱۹۳۶ء میں حکومت ہند کی نگرانی میں ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک طرحی مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ نمائش گاہ وکٹوریہ پارک چوک میں ایک بہت بڑا پنڈال مشاعرے کے لئے بنایا گیا تھا اور ہندوستان کے تمام چوٹی کے شعراء اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے، ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ تھا۔ حاضرین و سامعین بھی بے شمار تھے، اس سے پہلے ایسا عظیم الشان مشاعرہ میں نے نہیں دیکھا تھا رات بھر نشست رہی پھر دن کے دو بجے تک سلسلہ جاری رہا۔ رات کو مشاعرہ چل رہا تھا اور زیادہ تر نوجوان شعراء باہر سے آئے ہوئے، باری باری اسٹیج پر آکر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ جب ساغر نظامی نے اپنے مخصوص مترنم انداز میں کلام شروع کیا تو پورا پنڈال داد سے گونجنے لگا، ایک غزل کے بعد دوسری غزل کی فرمائش حاضرین نے شروع کر دی، مگر ساغر صاحب

سنا کر بیٹھ چکے تھے، تقاضے جاری رہے تو ساغر صاحب آئے اور انھوں نے یہ کہہ کر "میں بیس برس سے شاعروں کی سیکالوجی سے واقف ہوں" اسی سیکالوجی کے پیش نظر مزید سنانے سے انکار کر دیا، ان کے انکار پر حاضرین کی چیخ پکار اور بڑھ گئی۔ اچانک منتظمین مشاعرہ نے اعلان کیا کہ "اب جناب روش صدیقی اپنا کلام سنانے آرہے ہیں۔" یہ اعلان حاضرین و سامعین کی مرضی کے خلاف بھی تھا اور کیر اندازے کے مطابق ساغر نظامی کی عام شہرت اور آج کے مشاعرے میں ان کی کامیابی کے مقابلے میں روش صاحب کا تعارف بھی محدود تھا اور پنڈال کا عام رجحان بھی سازگار نہ تھا، پہلی بار میں نے روش صاحب کو دیکھا کہ ایک دبلا پتلا پستہ قد، نوجوان، مسکراتا ہوا کھڑا ہوا اور پیش رو کی کامیابی سے بے خوف و خطر وہ اسٹیج پر آیا۔ پنڈال بہت بڑا تھا اس لئے شاعر کو کھڑے ہو کر کلام سنانا پڑ رہا تھا، میری طرح سب ہی سمجھ رہے تھے کہ چل نہیں پائے گا، ــــــ دبلے پتلے شاعر نے جو گاڑھے کی شیروانی میں ملبوس اور کشتی نما ٹوپی بے ترتیب سی پہنے ہوئے تھا، پڑھنا شروع کیا، "جوش میں آ" "آغوش میں آ" ترنم بھی کوئی خاص نہ تھا مگر سامعین نے گوش ہوش سے اس کا کلام سنا اور خوب داد دی اور اس شعر پر بے حد داد دی ؎

اپنی بیگانہ نگاہی کا اثر دیکھ تو لے
رہزنِ ہوش! ذرا تمکنتِ ہوش میں آ

پہلی بار روش صاحب کو سن رہا تھا، داد دینے والوں میں اور "ایک اور" "ایک اور" کہنے والوں میں بھی پوری طرح شامل تھا، روش صاحب نے پوری طرح مشاعرے پر اپنا سکہ جما لیا تھا۔

اس کے بعد ہی سیاسی طوفان کا زمانہ آگیا، مسلم لیگ، کانگرس اور ہندو مہاسبھا، یہی اس وقت کی سیاسی جماعتیں تھیں، روش صاحب کو میں نے اس کے بعد کانگرس کی ضلع پولٹیکل کانفرنس میں کلام سناتے دیکھا وہ سیاسی اعتبار سے بھی ہم خیال نکلے، اس زمانے میں لکھنؤ سے حیات اللہ صاحب انصاری

کانگرسی ہفتہ وار اخبار "ہندوستان" نکال رہے تھے جو ہم خیالوں کے اجتماع کا ذریعہ بھی تھا، روشؔ صاحب ایسے محدود اجتماعوں میں بھی شریک ہوتے اگر لکھنؤ میں ہوتے اور ان کو معلوم ہو گیا۔

اس وقت سے ان سے ملنا جلنا برابر رہا، لکھنؤ آتے تو بھوپال ہاؤس (لال باغ) میں جس کی وسیع و عریض آراضی پر اب بھوپال ہاؤس مارکیٹ بن گئی ہے ٹھہرا کرتے تھے اور عموماً جگرؔ مراد آبادی مرحوم کے ساتھ ہوتے تھے وہ بھی وہیں ٹھہرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ جگرؔ صاحب ان سے اسی پر کبیدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے وضعداری کے خلاف بھوپال ہاؤس کے بجائے جہانگیر آباد پیلس میں ٹھہرنا شروع کر دیا تھا، اس وقت ان کے ایک قدردان عبدالغنی صاحب انصاری مرحوم (ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس) ریاست جہانگیر آباد کے منیجر تھے اور ممبر اسمبلی بھی وہ جہانگیر آباد پیلس میں ہی رہتے تھے، بھوپال ہاؤس کے مالکان میں سے بعض کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے باشندگان بھوپال ہاؤس کی مشترک جائیدادیں "متروکہ" ہو کر کسٹوڈین کے قبضے میں چلی گئی تھیں اور ہندوستان میں رہ جانے والے مالکان کی خوش حالی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے۔ جگرؔ صاحب مرحوم کو یہ گمان ہوا کہ "ترک قیام" کا سبب یہی ہوگا کہ اب پہلے کی طرح قیام کی سہولتیں وہاں نہیں رہی ہیں، گمان صحیح ہو یا غلط اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا اس طور پر کہ جگرؔ صاحب مرحوم جب کبھی لکھنؤ آتے تھے تو از راہِ شفقت غریب خانے پر ضرور تشریف لاتے اور فرماتے تھے کہ "اور جگہ لوگوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سناتا ہوں آپ کے یہاں میرا خود جی چاہتا ہے۔" بڑی بے تکلفی سے رہتے جتنی دیر رہتے تھے، وہ ہی زمانہ تھا کہ جگرؔ صاحب حسب دستور بھوپال ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور روشؔ صاحب خلاف معمول جہانگیر آباد پیلس میں، جگرؔ صاحب پروگرام کے مطابق رات کے کھانے پر میرے یہاں آنے والے تھے اس سے قبل انھیں نذرانے

ملا صاحب کے یہاں ایک ادبی نشست میں شریک ہونا تھا۔ میں بھی ملا صاحب کے یہاں تھا۔ جب وہاں سے چلنے لگے تو ایک عزیز کی موٹر میں بیٹھتے ہوئے میں نے رَوش صاحب سے جو پاس ہی کھڑے تھے درخواست کی کہ آپ بھی چلئے" وہ تیار ہو گئے۔ اب میں نے دیکھا کہ جگر صاحب مکدر ہیں۔ پھر وہ وہ مکدر ہی رہے۔ ہمارے ایک پرانے ساتھی جو اب پاکستان میں ہیں یعنی مکین احسن کلیم نے سنایا۔ تسکین قریشی صاحب بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے سنایا۔ مگر جگر صاحب معذرت کرتے رہے، بہت اصرار پر جگر صاحب نے بھی ایک غزل سنائی مگر تحت اللفظ۔ ظاہر ہے کہ جگر صاحب کے کلام کو ان کے مخصوص انداز غزل خوانی کے بغیر سننے میں وہ کیفیت کہاں پیدا ہو سکتی تھی! بڑی بے لطفی رہی اور رخصت ہوتے وقت جگر صاحب معذرت بھی کرتے رہے۔ اس وقت اس تکدر کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ بعد میں جگر صاحب نے بتایا کہ وہ کیوں بدمزہ تھے۔ میرا اپنا خیال، اس بنا پر کہ جگر صاحب سے بہت قریب رہا ہوں یہ ہے کہ چونکہ وہ بے حد ذکی الحس تھے اس لئے انھوں نے رَوش صاحب کی اس بالکل بے غرض و بے مقصد روش کو بہت مبالغے سے محسوس کر لیا۔ صاف دل بھی بہت تھے جب یہ بدگمانی نہ رہی تو رَوش صاحب سے تکدر بھی نہیں رہا۔

رَوش صاحب مرحوم سے میرے تعلقات برابر رہے مگر میں یہ دیکھتا رہا کہ میری طرف سے کیفیت یکساں ہے اور ان کی طرف سے خلوص میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے بلکہ آگے پیچھے چلنے میں بھی وہ ایک وضع پر قائم ہو گئے تھے۔ ایک دن آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن پر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ کسی طرح سبقت پر آمادہ نہ ہوئے یہی اصرار کرتے رہے کہ آپ پہلے تشریف لے جائیں۔ آپ مقتدی ہیں وغیرہ وغیرہ، میری حیرانی دیکھ کر انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ پیری مریدی کے سلسلے میں فرنگی محل کے خاندان سے منسلک ہیں۔ یہ

ادب واحترام اسی نسبت کی بنا پر کرتے ہیں میرے لئے یہ واقعی انکشاف تھا۔ جس پر خوشی کے ساتھ حیرانی بھی ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے والد سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں شمس العلماء مولانا عبدالحمید فرنگی محلی مرحوم کے مرید تھے اور خود روش صاحب کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے اور اس تعلق پر انھیں فخر بھی تھا۔

وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ تو تھے ہی لیکن یہ آج ہی مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے بتایا کہ وہ تہجد گزار بھی تھے۔ کلکتہ میں پھر علی گڑھ میں وہ مولانا اکبر آبادی صاحب کے یہاں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ مولانا کی روایت چشم دید ہے۔ ان کا بیان ہے کہ تہجد کو اٹھنے کے بعد پھر طلوع آفتاب تک وہ مصلے ہی پر رہتے تھے۔

وہ غزل گو شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی نظمیں بھی ہیں جن میں مذہبی جھلک خاصی نمایاں ہے۔ نعتیہ مشاعروں میں بھی انھوں نے اچھی اچھی نظمیں پڑھیں۔ مدح صحابہ کے مشاعروں میں بھی محض تک بندی نہیں ہوتی تھی کہ سننے والے صرف عقیدت میں داد دیتے ہوں۔ لکھنؤ کے نعتیہ مشاعرے میں جو نظم پڑھی تھی اس میں حضرت علیؓ کی شان میں ان کا مصرعہ تھا:

"دوشِ حیدرؓ پہ جو چمکے وہ قلم کس کے تھے؟"

گاندھی جی کی تعزیت میں جو نظم انھوں نے کہی تھی اس میں ان کی ذہانت نے یہ رمز ڈھونڈ لیا تھا کہ گاندھی جی جس آخری اجتماع میں شریک ہوئے وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا سالانہ عرس تھا جو پہلی بار تقسیم ہند کے بعد ہونے والے دلی کے فسادات کے دوران میں گاندھی جی ہی کے شدید تقاضے پر منعقد ہوا تھا اور امن و امان کی صورت حال عرس کرنے کی اجازت بالکل نہیں دے رہی تھی۔ اس اجتماع میں شرکت کے بعد گاندھی جی کسی اور جلسے میں شریک نہ ہوئے سوائے روزانہ کی پرارتھنا کے، اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے روش

صاحب نے کہا تھا:

بلا کے بارگہ بختیار کاکیؒ میں
خبر نہیں کہ مشیت نے کیا دیا مجھکو

گزشتہ سال دسمبر ۱۹۶۹ء میں اس دن علی گڑھ آئے تھے جس دن بادشاہ خان (خان عبدالغفار خاں) دلی سے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ باتیں ہونے لگیں، میں نے "بارگہ بختیار کاکیؒ" والا شعر پڑھ کر اس نکتہ رسی کی داد دی تو انھوں نے بہت مسرت ظاہر کرتے ہوئے اس شعر کی ایک عرفانی وجہ بھی بتائی تھی۔

باتوں میں نماز مغرب کا وقت آگیا۔ بادشاہ خان کمرے میں تھے ہم لوگ اولڈ بوائز لاج کے ہال میں باتیں کر رہے تھے۔ وہیں نماز کا انتظام ہوا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے کسی طرح امامت نہیں کی اور مجھے حکم دیا، نماز ختم ہونے پر دیکھا کہ بادشاہ خاں بھی جماعت میں شریک ہیں۔ سنتیں پڑھنے کے بعد پھر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے بادشاہ خاں کی شرکت نماز کا ذکر کیا تو رَوش صاحب نے بتایا کہ "میں نے تو ان سے جمعہ کی امامت کرائی ہے اور مجاہد کے انداز سے ان کی قرأت ہوئی ہے۔"

"یہ کب؟"

"جوالاپور میں ایک دفعہ آئے تھے جمعہ کا دن تھا، سب کی خواہش تھی کہ خان عبدالغفار خاں جمعہ کی نماز پڑھائیں اور انھوں نے پڑھائی۔"

رَوش صاحب، جوالاپور (سہارنپور) میں رہتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت یوپی کے مغربی اضلاع میں جو فسادات ہوئے اس سے جوالاپور بے حد متاثر ہوا، اس زمانے میں ایک افواہ یہ تک اڑی تھی کہ رَوش صاحب اس میں شہید ہوگئے ہیں۔

جوالاپور سے بطور پناہ گزین وہ مراد آباد چلے آئے جہاں ان کی سسرال

تھی، پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقلاً میرٹھ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

مطالعے کے شوقین تھے، ادبی کتابوں کے علاوہ تصوف سے خاص شوق تھا، پورا کتب خانہ تو جوالاپور میں غارت ہو چکا تھا، ادھر بیس برس کے عرصے میں انھوں نے خاصی کتابیں جمع کر لی تھیں۔ سلسلہ قادریہ رزاقیہ کے شیخ حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رح کے حالات میں کوئی قلمی کتاب بہت خراب وخستہ حالت میں انھیں میرٹھ میں ملی تھی جس کو اچھی قیمت پر خرید لیا تھا۔ اس کتاب سے بہت خوش تھے۔ مجھ سے وعدہ تھا کہ اس کی زیارت کرائیں گے۔ اب اس کے ایفا ہونے کا کوئی محل نہیں رہا۔

شاہجہاں پور میں انتقال ہوا۔ یہ شہر سلسلہ قادریہ رزاقیہ کا مرکز رہا ہے جہاں حضرت محمد اسحاق شاہجہاں پوریؒ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالرزاق بانسویؒ) سے بہت فیض جاری ہوا اور اب بھی یہ سلسلہ وہاں موجود ہے۔ وفات کے وقت روش صاحب ۶۱ سال کے تھے۔ لیکن جس نے انھیں دیکھا ہے وہ یقین نہیں کرے گا کہ یہ عمر تھی، اس سے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔

روشؔ کے کلام میں بڑی معنویت ہوتی ہے، مذہب کے حکیمانہ نظریات کو سمجھ بوجھ کر فلسفیانہ انداز سے پیش کرنے میں ان کا خاص مرتبہ ہے، اسی وجہ سے ان کے یہاں فکری عنصر بہت ہے، رعنائیٔ خیال کی لہریں ہر جگہ رواں ہیں، غالباً یہی اندازِ بیان ان کو مجبور یا مائل کرتا ہے کہ وہ فارسی آمیز زبان وبیان استعمال کریں، کیونکہ بلندیٔ خیال کو قلم بند کرنے کے لئے عام اندازِ بیان پوری طرح کام نہیں دیتا، جہاں کہیں وہ زبان و بیان کے لحاظ سے دقیق مسائل نظم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہاں ان کے اشعار فکر و محسوسات کا آئینہ ہو گئے ہیں

روشؔ کی اختراع پسند طبیعت کا اندازہ ان کی نئی تشبیہوں اور دلآویز ترکیبوں سے بھی ہوتا ہے، ان سب باتوں کا اثر یہ ہے کہ بیان میں تازگی آجاتی ہے۔ وہ اردو شاعری کی رسمی وروایتی باتیں نظم کرتے ہیں تو اپنے طور پر ان کو بھی اندازِ بیان سے شگفتہ بنا دیتے ہیں۔

روشؔ نے حسرتؔ موہانی کی طرح غزلوں میں زیادہ تر حسن و عشق کی روداد پیش کی ہے، اپنے عہد کی سیاسی یا سماجی کشمکش پر بہت کم خیال آرائی کی ہے۔ نظمیں ان کی لب ولہجہ کے لحاظ سے نہایت بلند آہنگ و پرشکوہ ہیں۔۔۔۔ روشؔ نے اتنی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں کہ کئی جلدوں میں شائع ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

(مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۰۷۔۳۰۸)

ملک زادہ منظور احمد

(۶)

اب تو یادیں بھی دھندلی پڑ گئی ہیں۔

گذشتہ بیس سال کے دوران میں ہم کب کب اور کہاں کہاں ملے، تسلسل کے ساتھ ذہن کے پردے پر نہیں ابھرتا۔ قصباتی مشاعروں سے لیکر دلی کے شنکر وشاد انڈو پاکستان مشاعرہ تک، ہندوستان کے طول و عرض میں صدہا بار ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خلوت و جلوت میں ساتھ رہا، سفر میں ہمسفر ہوا، اولیاء کرام کے مزارات پر ساتھ ساتھ حاضری دی۔ مگر زندگی کا کوئی غیر محتاط لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب ترُوش صاحب کے مزاج کی "مشرقیت" ان سے الگ ہوئی۔ وہی شفقت، وہی مروّت، وہی تہذیب نفس، وہی دلدہی و دلداری جو مشرقی مزاج کا خاصہ رہی ہے ان کی شخصیت میں حلول کر گئی تھی اور جو ہمارے دور کے مشاعروں کی پیشہ ورانہ فضا میں تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ شعری صلاحیت اور شاعرانہ اکتسابات سے قطع نظر، ان کی شخصیت ایک تہذیب اور ایک روایت تھی۔ یہ ممکن ہے کہ ان سے اچھے شعر کہنے والے پیدا ہو جائیں مگر دور حاضر کے ہاتھوں میں "آبِ حیات" کا وہ جام ہی نہیں ہے جو ان پرانے بادہ کشوں کی تہذیبی روایات کو بقائے دوام عطا کر سکے۔

ابھی تقریباً دو ہفتے قبل قیصر باغ کے چوراہے پر ان سے ملاقات

ہوئی، میں اورائی کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے چارباغ جارہا تھا اور وہ بہرائچ کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے بس اسٹیشن جارہے تھے، ہم دونوں عجلت میں تھے۔ سلام وپیام کے بعد کہنے لگے "کئی مشاعروں کے دعوت نامے تھے، میں نے بہرائچ کو ترجیح دی، اقتصادی مفاد سے الگ، سید سالار مسعود غازیؒ کے مزار کی زیارت کی کشش بھی شامل تھی، کل واپس لوٹوں گا، اور اردو بورڈ کے جلسہ میں شرکت کرکے میرٹھ لوٹ جاؤں گا۔" میں نے سوچا کہ آج کل مشاعروں کا موسم ہے، کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی۔ رہ اروی میں آگے بڑھ گیا۔

اور آج صبح جب میں اناؤ کے مشاعرہ سے واپس لوٹا تو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ گذشتہ شب شاہجہانپور کے مشاعرہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دل کو ایک دھچکا لگا جن احوال وظروف میں ان کی موت ہوئی اس نے اس المیہ کو اور بھی گہرا کر دیا۔ سارا ماضی سمٹ کر ایک لمحہ میں نگاہوں کے سامنے آگیا۔ تصورات میں پرچھائیاں ابھریں۔

ایک ملاقات کی روداد

روش صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا۔

آپریٹر سے کنکشن مانگا۔ اور جب رابطہ قائم ہوگیا، تو بولے مونگا صاحب۔ جی۔ جی ذرا دو چائے اور ہاں کچھ سنڈوچز بھی۔ شکریہ۔ شکریہ۔

یہ مئی ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ میں یونین پبلک سروس کمیشن کے ایک انٹرویو کے سلسلہ میں دلی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد احباب سے ملنے کی خاطر ریڈیو اسٹیشن چلا آیا۔ سب سے پہلے جس پر نگاہ پڑی وہ جناب روش صدیقی تھے۔ ہاتھ میں ایک دبیز اور بھاری بھرکم چرمی بیگ لٹکائے ہوئے وہ آکاش وانی بھون کے چکردار زینے پر چڑھ رہے تھے۔ ایک تو ان کا بوٹا سا قد، اور پھر اس پر ان کا لحیم شحیم تنومند ہینڈ بیگ، مجھے ان کی حالت قابل رحم معلوم

ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے پر بار ہو رہے تھے۔ بہزار دقت وہ اپنے کمرے میں پہونچے اور میں نے ان کو جا دبوچا۔ وہ حسب معمول بڑے خلوص وتپاک سے ملے اور بڑی دیر تک ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔

شاعری کی خصوصیات

روشن صاحب کی شاعری کی عمر میری اصل عمر سے کئی سال زیادہ ہے۔ اور اس طویل عرصے میں انھوں نے "محراب غزل" کی انجمن آرائی، صدہا لالۂ گل اور ہزارہا ماہ و انجم سے کی ہے۔ کہیں رنگ الم ہے کہیں رنگ نشاط، کہیں نالۂ نیم شبی ہے کہیں سکوت ازلی، کہیں ہستی و مرگ کے فرسودہ مسائل ہیں کہیں فلسفۂ غیب وشہود، کہیں نکہت زلف پریشاں ہے اور کہیں لب لعلیں کی توبہ شکن فضائیں۔ مگر انھوں نے ہر ہر مرحلے میں انداز تکلم کے ہزاروں اسلوب پیدا کئے ہیں اور ان کی غزلیں آئینۂ ایام میں صدہا طریقے سے نکھری اور سنوری ہیں۔ کبھی صداقت اور حق گوئی کی بات چلی ہے تو ان کی غزل نے دار پہ چڑھ کر افسانۂ منصور دہرایا ہے۔ ظلم اور ستم کے مقابلے میں سینہ سپر ہوئے ہیں تو شاخ گل جیسی نازک غزل تا لب شمشیر میں ڈھل کر ان کے ہاتھوں میں لچکی ہے۔ اگر ایک طرف وہ سرود برہمن لے کر کعبے کے دروازے تک پہونچے ہیں تو دوسری طرف غزل خوان حرم بن کر صنم خانوں میں بھی نظر آئے ہیں۔ کبھی وہ دل کو آتش دوراں کے سپرد کر کے آشوب جہاں کے تماشائی بنے ہیں، تو کبھی کسی کی نگہ دل ستاں کے عطیہ کو نشاط جاوداں بنا کر انھوں نے اپنی تہی دامنی کو کوتاہ دامنی میں تبدیل کر لیا ہے لیکن زندگی اور حوادثات کے نشیب و فراز میں وہ آب رواں کی مانند جن جن جادوں سے گزرے ہیں، شوکت الفاظ اور مرصع کاری کی زرنگار سپر ان کے موضوعات کے اوپر ہمیشہ سایہ فگن رہی ہے، فارسی ترکیبوں اور اضافتوں کی بدلیاں

کبھی اس قدر گہری ہوئی ہیں کہ حسنِ معنی کی تجلیاں انہی کے اندر گم ہو کر رہ گئی ہیں یہ بھی ہوا ہے کہ الفاظ کی پرشکوہ گھنگھور گھٹائیں امنڈ امنڈ کر چھائی ہیں، گرجی ہیں، مگر بغیر برسے ہوئے آگے گزر گئی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر جن جن مقامات پر موضوع اور فن میں ہم آہنگی پیدا ہوئی ہے، وہاں وہاں ان کی غزلوں کی مرصع کاری اور معصوم نگاہی آیات الٰہی کا ایک اعجاز بن گئی ہے۔ ستاروں نے ان کے نقش قدم پر سر جھکایا اور سحر کی روشنی ان کے ہمراہ معانی اور مطالب کے شبستانوں سے گزری ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دلِ رَوِش کو ترے انتظار نے اے دوست
چراغِ صبح کیا، آفتابِ شام کیا

زندگی اس کی ہے بس اے سرو ناز
پڑ گئیں جس پر تری پرچھائیاں

زندگی ...جی چرا کر رہ گئی
کون مرتا تیرے دیوانے کے ساتھ

دور ہی دور ذرا گردشِ دوراں کہ رَوِش
منسلک سلسلۂ زلف گرہ گیر میں ہے

حرم نادیدہ بت خانہ گریزاں برہمن رہبر
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے

توڑ کر اٹھے ہیں جام و شیشہ و پیمانہ ہم

کس سے کہدیں آج رازِ نرگسِ مستانہ ہم

بجلیاں روپوش طوفاں دم بخود ششدر حیات
جا رہے ہیں کس طرف لے لغزشِ مستانہ ہم

بڑھانا چاہتا ہوں وسعتیں خواب محبت کی
مجھے اب زندگی تیری ضرورت ہوتی جاتی ہے

ان اشعار میں اگر ایک طرف فکر و تفکر کی گہرائی ہے تو دوسری طرف الفاظ کا شکوہ بھی موجود ہے۔ فکر کی گہرائی تو یہاں وہاں کبھی کبھی کم بھی ہو جاتی ہے لیکن جہاں تک الفاظ کی دیدہ زیبی، شوکت اور عظمت کا تعلق ہے وہ رَوش کے پورے مجموعۂ کلام کو محیط کئے ہوئے ہے اور یہی چیز رَوش کی شاعری کا انفرادی اور امتیازی نشان ہے جو ان کے معاصرین میں کم لوگوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔

نظمیں

غزلوں کے علاوہ رَوش صدیقی کی وہ نظمیں جو آزادئ وطن سے پہلے وہ مختلف مقامات پر مشاعروں میں پڑھتے تھے ان کی شہرت اور وقار کی ضامن ہیں، ان شعراء میں جنھوں نے آزادئ وطن کے موضوعات پر نظمیں لکھیں اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ رَوش صاحب کا لہجہ کافی موثر اور متوازن تھا۔ ان کے یہاں الفاظ کا وہ گھن گرج، عبارت کا وہ زور و شور، طمطراق اور طنطنہ اور لہجہ کا وہ تلخ اور طوفانی انداز تو نہ تھا جو جوش ملیح آبادی کے یہاں پایا جاتا ہے بلکہ جذباتیت کے ساتھ ساتھ ان کی وطنیت میں ایک ہمہ گیر آفاقیت

ایک ذمہ داری اور ایک پر وقار عزم کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غلامی کی مذمت، وطن سے محبت، ماحول سے ناآسودگی اور ایک نئے سماج کی تخلیق کا عزم، یہ تمام جذبے ان کی نظموں میں بھرپور طریقے پر اجاگر ہوئے ہیں۔

ان کے اس انقلابی تصور کے پیچھے نری جذباتیت تھی۔ یا کوئی سوچا سمجھا ہوا راسخ عقیدہ۔ یہ بات موضوع بحث بن سکتی ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ چاہے ان کی نظمیں جذباتی ہیجان کا نتیجہ رہی ہوں یا باضابطہ طریقہ پر ان کی تخلیق کسی انقلابی تصور کی مرہون منت رہی ہو، وہ بہرحال ہندوستان کی آزادی میں معاون ثابت ہوئیں۔ اور اگر ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہو جاتیں تو وہ آزادیٔ وطن کی ادبی جدوجہد میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتیں۔

ان کی ان نظموں سے جرأت اور جراری کا جذبہ برانگیختہ ہوتا ہے اور ان کا آہنگ بہت زیادہ سریع التاثیر ہے۔ ان کی آواز کی متوازن بلند آہنگی ان کے الفاظ کا معتدل زور و شور اور ان کی بندشوں کا رعب و دبدبہ اپنے اندر فوجی موسیقی کا کیف رکھتا ہے:

ایک ذرہ بھی نہیں مہر درخشاں کا غلام
ایک تنکا بھی نہیں صحن گلستاں کا غلام
ایک لمحہ بھی نہیں گردشِ دوراں کا غلام
کوئی انسان ہو پھر کیوں کسی انساں کا غلام
دہر کو جنتِ آزادیٔ انساں کر دیں

ایک ایسے دور میں جبکہ برطانوی حکومت سے نفرت کے باعث ملک کے بیشتر شاعروں کی جذباتیت تلخی اور غیض و غضب کا شکار ہو کر اندھی ہو گئی تھی۔ رَوش کے کلام کا یہ منطقی استدلال اور لہجہ کی یہ آفاقیت طبیعت کے اعتدال اور جذبات کے اوپر عقل کی حکمرانی کا نتیجہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم رَوش کے انقلابی تصور

کو خالص، جذباتی نہ سمجھیں۔

کہر آلود چاندنی

مجموعی طور پر رَوش کی غزلوں اور نظموں دونوں پر فکر وفن، جنون وہوش اور دل ودماغ کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے مگر یہ چاندنی نہ تو مارچ اور اپریل کی صاف وشفاف چاندنی ہے اور نہ جولائی اور اگست کی بھیگی ہوئی چاندنی۔ بلکہ دسمبر اور جنوری کی کہر آلود چاندنی ہے۔ جس میں شاعر کی تخئیل کے خدوخال بظاہر تو دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں، مگر ذرا سے تامل اور تفکر کے بعد ان کے نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات جو سوچ وبچار کے عادی نہیں ہیں وہ پہلی نظر میں رَوش کے اکتسابات پر ابہام کا الزام لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے عروسِ معنی کو الفاظ کا جو پیرہن عطا کیا ہے وہ نائلان کا نہیں ہے جس سے جسم کے دلآویز خطوط خود بخود واضح ہو جائیں بلکہ وہ سلمہ اور ستاروں سے سجا ہوا ململ کا وہ دوپٹہ ہے جس کے اندر چھپا ہوا حسین چہرہ اسی وقت نظر آسکتا ہے جب اس پر گہری نگاہ ڈالی جائے اور غور وخوض سے کام لیا جائے۔

روشؔ مرحوم کو لوگ نظم گو شاعر کہتے رہے ہیں، لیکن میں ان کی غزل سے ہمیشہ متاثر رہا ہوں اور انھیں اس دور کے چند اچھے غزل گو شعراء میں شمار کرتا رہا ہوں۔ ان کی بے شمار نظمیں مختلف جرائد میں چھپتی رہیں اور وہ اپنی نظم گوئی کا سکہ منواتے رہے، مگر میں ان کی غزل کا مداح رہا ہوں اور نظموں میں بھی مزاج غزل نے کیفیت بھردی ہے۔

روشؔ مرحوم عرف عام میں نسبتاً چھوٹے قد کے تھے مگر شخصیت کے اعتبار سے بہت بلند قد انسان تھے، اچھے دوست، مخلص عزیز، شریف آدمی اور مشرقی تہذیب کا چلتا پھرتا جادو، شاعری میں قدیم روایات کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات شیروشکر، صوم وصلوٰۃ کے پابند، متقی اور پرہیز پسند، ذہن تصوف کے گہرے نقوش لئے ہوئے، مزاج میں سادگی اور اس کے ساتھ استحکام، انسان برادری کے ماننے والے تھے اور اللہ کو رب العالمین جاننے والے تھے۔ ہائے کیا اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ سیاسی نظریات سے سوفیصدی اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی میں ان کو راسخ العقیدہ مسلمان کہنے پر مجبور ہوں۔

ڈاکٹر سید یاور عباس (ماہنامہ جام جم (کراچی)، جون ۱۹۷۱ء)

حمیدہ سلطان

(۷)

رَوش صدیقی کا نام دنیائے ادب میں اِس وقت روشناس ہو چکا تھا، جب میں طالب علم تھی، آل انڈیا قسم کے ہر مشاعرے میں ریڈیو پر وہ لمبی لمبی رومانی نظمیں بہت ولولہ انگیز انداز میں سناتے تھے۔ میں پورا شعور نہ ہونے پر بھی شعر و ادب کی شوقین تھی اور ہر مشاعرے کو جو ریڈیو پر ہوتا تھا بہت شوق سے سنتی تھی۔ چند سال بعد ریڈیو پروگراموں کے سلسلے میں ن۔م۔ راشد صاحب سے میری واقفیت ہو گئی۔ وہ اِن دنوں دلی ریڈیو اسٹیشن میں کام کر رہے تھے۔ اوائل گرمی کی ایک دوپہر راشد صاحب کا فون آیا، کیا آج شام کو آپ مل سکیں گی۔ رَوش صاحب آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں میں نے کہا "ہاں ضرور۔"

باہر لان پر بھائیوں کے ساتھ بیٹھی میں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی کہ گداز جسم اور لمبے قد والے راشد صاحب کے ساتھ ایک زار و نزار جسم کا پست قد انسان کھدر کی شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس داخل ہوا، راشد صاحب نے تعارف کرایا "یہ ہیں حضرت رَوش صدیقی۔"

مجھ پر رَوش کی شخصیت کا کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن گھر آئے مہمان کی خاطر ضروری تھی۔ چائے اور لوازمات منگوائے پھر کلام سنانے کی فرمائش کی رَوش نے اپنی کوئی تازہ نظم سنائی میں نے رسمی طور پر

داد دی، مغرب کا وقت ہوگیا اُنھوں نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ اس میں ذرا چونکی۔ میں نے کسی شاعر کو نماز پڑھنے کی خواہش کرتے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ نماز کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر رَوش رخصت ہوگئے۔ میں حسب معمول لئے دیئے رہی۔ پھر آنے کے لئے نہیں کہا۔

تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۱۹۴۲ء میں ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں روش صدیقی بھی اور شعراء کے ساتھ ملے۔ رسمی علیک سلیک کے علاوہ میری ان سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ کئی سال گذر گئے۔ ۱۹۴۸ء جنوری میں مسلم آزاد کانفرنس میں شرکت کے لئے شیلانگ سے لکھنؤ ہم لوگ آئے تھے، مسز سروجنی نائیڈو اس زمانے میں یو۔پی کی گورنر تھیں۔ میں والدہ صاحبہ کے ساتھ ان سے ملنے گئی۔ تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے گورنمنٹ ہاؤس میں دوسرے دن ہونے والے مشاعرے میں مجھے مدعو کیا۔ اس میں رَوش بھی شریک تھے۔ ان کا گھر جوالاپور میں لٹ چکا تھا، ان کے حساس دل پر اس کا بہت اثر تھا۔ وہ مضطرب لگ رہے تھے، میں بھی دلی کی تباہی اور اپنے گھر کی بربادی پر غمگین تھی۔ رَوش مجاز سے قریب ہی بیٹھے تھے۔ میں مجاز سے بے تکلف تھی، ان سے باتیں کرتی رہی، رسمی طور پر رَوش کی بھی مزاج پرسی کرلی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور لبوں پر ایک حزیں سی مسکراہٹ اُن کے آگئی لیکن وہ کھوئے کھوئے سے رہے۔

انجمن ترقی اردو کو اس پر آشوب دور میں سخت نقصان پہنچا تھا۔ حضرت مولانا آزاد علیہ رحمۃ کی کوشش سے اس کی ابتری دور ہوئی مرکزی دفتر علی گڑھ پہنچ گیا۔ دلّی میں انجمن کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ میں نے علامہ کیفی کی مدد سے انجمن کی دلّی شاخ قائم کی اور یوم غالب کی طرح ڈالی، ۱۹۵۰ء کے یوم غالب کے مشاعرے میں رَوش آئے وہ اِن دنوں مرادآباد میں رہتے تھے۔ میں نے اِن کو آمد و رفت کا بہت معمول کرایہ دیا تھا، قیام و

طعام کے لیے کچھ نہیں دے سکی تھی، لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کوئی مطالبہ نہیں کیا، اور ان دگرگوں حالات میں میرے کام کرنے کا بار بار انھوں نے بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔ انجمن ترقی اردو دلی شاخ کے وسائل محدود تھے۔ بمشکل علمیات لے کر ہر سال یوم غالب منایا جاتا رہا۔ اور اس کے ہر مشاعرے میں روش آتے رہے اور لوگوں کی طرح انھوں نے این و آں کبھی نہیں کی، روپے کی کمی اور انجمن کی مالی حالت کا پورا احساس روش کو تھا، اس لئے جب جو بھی چاہا میں نے دیدیا انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

۱۹۵۷ء میں آل انڈیا ریڈیو میں چیف پروڈیوسر ہو کر وہ آ گئے تو پھر اکثر ملنا رہتا تھا۔ کبھی ادبی نشستوں اور مشاعروں میں کبھی جاننے والوں کے یہاں، انجمن کی ادبی نشستوں میں وہ بلا ناغہ شرکت کرتے تھے، روش کی یہ کمزوری تھی کہ وہ کوئی کام کوشش کر کے اپنے لئے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سرکاری گھر اُن کو کافی دیر میں ملا۔ کچھ مہینے اپنے ایک دوست کے یہاں رہنے کے بعد اس لئے وہاں نہیں رہنا چاہتے تھے کہ اُن کے دوست کی بیوی پردہ نشین خاتون تھی اور میر کچھ اور عزیز خواتین آنے والی تھیں میرے سامنے اپنی اِس پریشانی کا ذکر کیا، تو میں نے کہا۔ انجمن کے دفتر کا بالائی حصہ فی الحال خالی ہے، یہ آپ کے لئے کوئی زیادہ آسائش کی جگہ نہ ہوگی۔ مگر جب تک آپ کو گھر نہ ملے شوق سے یہاں قیام کیجئے۔ تقریباً ڈھائی مہینے وہ یہاں رہے، اور روش کو قریب سے دیکھنے کا موقع اِس وقت مجھے ملا۔ وہ ایک اچھے شاعر تو تھے ہی۔ مگر اس سے بڑھ کر مخلص اور نیک انسان تھے۔ قدرت نے ان کو سوز و گداز سے لبریز دل دیا تھا۔ کسی کی ذرا سی تکلیف اور تھوڑی پریشانی کو اس طرح محسوس کرتے تھے گویا یہ تکلیف خود اِن پر گذر رہی ہے، فطرت نے واقعی روش کو ایک

عظیم فنکار کا حساس دل دیا تھا، آج کل کی جھوٹی، خود غرض، مطلبی دنیا سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی ہر حال میں مدد کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ نشیب و فرازِ زمانہ سے بے خبر، والہانہ کیفیت سے سرشار، اپنے حال میں مگن رَوش ہر وقت نظر آتے تھے۔ ان کو دو ہی مشغلے محبوب تھے اللہ کی یاد اور فکر شعر میں غرق رہنا۔

اس خود غرض دنیا کی مخلوق میں کسی طرح بھی رَوش کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ میں جب ان سے بے تکلف ہو گئی تو اکثر ان کی والہانہ کیفیت پر جھنجھلا جاتی تھی، اور بگڑ کر کہتی کہ "آپ کس قسم کے انسان ہیں وظیفہ اتنی دیر پڑھتے ہیں کہ چائے ٹھنڈی پانی ہو جاتی ہے۔ لکھنے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ کھانے کا خیال نہیں رہتا۔" اس دنیا کے لوگ رَوش کو بھی موجودہ دور کے میزان پر تولنا چاہتے تھے۔ دفتر میں دیر سے جانے کا افسانہ بھی یونہی بنا کہ اُن کے والد سخت علیل تھے اور وہ اپنے شفیق باپ کی تیمار داری میں مصروف ہو کر اکثر اپنے دفتری اوقات کی پابندی نہیں کر سکتے تھے اور افسرانِ بالا دست کی خوشامد کرنا تو بالکل رَوش کے بس کی بات نہ تھی وہ تو بہت رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ نہ کسی سے نفرت نہ محبت۔ نہ بناوٹ نہ چاپلوسی۔ بات نبھتی تو کیسے؟ افسوس آزادیٔ وطن کے نغمے گانے والے اس مغنی کی قدر قومی حکومت نہ کر سکی۔ مولانا آزاد جو فنکاروں اور ادیبوں کے قدر دان تھے اب موجود نہیں تھے جو رَوش کی اس فرو گذاشت کو نظر انداز کر دیا جاتا اور کام ٹھیک وقت پر کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ اس طرح چھ سال بعد آل انڈیا ریڈیو سے رَوش الگ ہو گئے اور معاشی پریشانی اُن کے دامنگیر ہو گئی، مگر وہ اتنے خوددار انسان تھے کہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی انھوں نے اس عالم میں مالی امداد نہیں لی اور نہ بیوی بچوں کو کبھی اس کا احساس ہونے دیا کہ ان کی آمدنی

اب باقاعدہ نہیں ہے، ملازمت کے زمانے میں جو تھوڑا روپیہ بنک میں جمع کیا تھا، اس میں سے ہر ماہ کچھ نہ کچھ نکالتے اور مشاعروں سے جو ملتا وہ ملا کر کام چلاتے رہے۔ یوں تو جب انسان کا وقت آتا ہے چلا جاتا ہے لیکن رَوش کو ان کی غیرت وخود داری نے ختم کر دیا، وہ ظاہری بھرم نہ جانے کس قدر مشکلات اٹھا کر اور اپنی جان کو ہلکان کر کے بنائے ہوئے تھے۔ صحت خراب ہونے کے باوجود وہ مشاعرے میں جاتے اور جو تھوڑا بہت ملتا وہ بیوی کی جھولی میں لا کر ڈال دیتے۔ سوگھڑ بیوی جوڑ توڑ کر کے اپنے غیرت مند شوہر کی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن رَوش کو یہ غم اندر ہی اندر ختم کرتا رہا کہ اگر بنک کا روپیہ بالکل ختم ہو گیا تو اپنے ان عزیزوں کی مدد کیسے کر سکیں گے جن کو برابر اس تنگی ترشی کے زمانے میں بھی دیتے رہتے تھے۔ اس عالم میں بھی رَوش کی خودداری کا یہ حال تھا کہ اِن کے بڑے لڑکے کو وزارت صحت نے جب ریسرچ کے لئے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا تو انھوں نے بیٹے سے کہا۔ یہ روپیہ تم جمع کرتے رہو، میں تمھاری پڑھائی کا خرچ حسب معمول دیتا رہوں گا۔ یہ تو کسی غریب لڑکے کا حق ہے۔ ریسرچ ختم ہو جانے کے بعد وزارت کو شکریے کے ساتھ روپیہ واپس کر دیا جائے گا۔ وہ برابر ماہانہ خرچ لڑکے کو بھیجتے رہے۔ ان کے بعد ہی اس روپے کو شاہد سعید نے استعمال کیا۔ اتنی بگڑی ہوئی مالی حالت میں کوئی اور انسان یہ ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ایسی امداد سے بھی منہ پھیر لے جو حکومت کی جانب سے مل رہی ہو۔

رَوش کی شاعری اور اِن کے فن کے متعلق تو لکھنے والے لکھیں گے، مجھے تو ان کے ان اوصاف کا ذکر کرنا ہے جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔ میں پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ اِن جیسا بلند کردار اور غیور شاعر

ہندوستان میں اب اور کوئی نہیں ہے۔ شہرت، جاہ طلبی اور دنیوی عیش کی جانب کبھی اس نیک انسان نے نظر نہیں ڈالی، رَوش کا سرمایہ ان کا فن تھا۔ وہ ایک سچے فنکار تھے جو کچھ لکھتے یا کہتے تھے اپنی دلی لگن سے اور خود کو مطمئن کرنے کے لئے۔ کسی اور کی تعریف اور ہجو سے ان کو سروکار نہ تھا۔

اِن کا صرف غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ محراب غزل' اور ایک طویل نظم 'کارواں' چھپ سکی ہے، وہ خود کو نمایاں کرنے کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے، حالانکہ تقریباً دو سو نظمیں اور اتنی ہی غزلیں ان کی ہیں کہ کافی ضخیم دیوان ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ میں ہمیشہ ان پر تقاضا کرتی رہی، "آپ جلد ہی اپنا کلام چھپوائیے۔" اس کا جواب ہمیشہ یہی ملتا "ہاں انشاء اللہ" لیکن وفات سے دو مہینے قبل جب میں نے کہا تو مسکرا کر جواب دیا، "اب تو میرے مرنے کے بعد میرا کلام چھپے گا۔" مجھے حیرت تھی کہ باوجود مالی پریشانی اور کشاکشِ روزگار وہ کیسے نئی نئی غزلیں کہتے رہتے ہیں۔ اس کا اظہار میں نے رَوش سے کیا بھی اور کہا " یہ کمال ہے کہ آپ کی ذاتی پریشانی سے آپ کی شاعری متاثر نہیں، آپ کے خیالات ایسے ہی تازہ اور شگفتہ ہیں، جیسے خوش و خرم انسان کے۔ آپ مضامین نو بہ نو کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔" رَوش کے لبوں پر اس طرح ہنسی آئی جس طرح زخمِ دل کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہوں اور انھوں نے لمبا سانس کھینچ کر کہا "ہاں، خدا کا شکر ہے کہ میری مالی پریشانی اور خانگی افکار نے میری شاعری کو متاثر نہیں کیا، ورنہ جیتے جی میری موت ہو جاتی۔" اور واقعی یہ قدرت کا انعام تھا۔ نظم ہو یا غزل و رباعی، رَوش کی حسن پسند اور حسن آفریں طبیعت نے نگار خانے سجا دیئے ہیں۔ ان کی زندگی شرافت کردار اور فضائل اخلاق کی راہوں سے گذری ہے اس لئے جذبات کی فراوانی میں بھی متانت کا دامن ان کے ہاتھ سے

نہیں چھوٹتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جیسا کسی انسان کا مزاج ہوتا ہے، اس کے فن میں اس کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، غالب سو سال سے زیادہ گذر جانے کے بعد بھی آج یوں زندہ ہیں کہ نفسیاتِ انسانی کے بہت بڑے نبّاض اور کھری بات شاعری میں بھی کہنے کے قائل ہیں۔

دل پر کوئی جذبہ نہ گذرے اور شعر کہہ لیا جائے تو وہ تک بندی سے زیادہ کا معاملہ نہیں ہوتا۔ رَوش کی شاعری ان کی کیفیاتِ قلبی کا آئینہ ہے ایک سچے فنکار کو کسی عارضی نشے کی ضرورت نہیں۔ رَوش بھی ہمیشہ بے پئے اپنے والہانہ جذبات میں محو ہو کر جھومتے رہے۔

اب رَوش کے کچھ شعر پیش کر رہی ہوں دیکھئے ان میں شاعر کا دل دھڑک رہا ہے یا نہیں۔

ایک نیا رنگ دیا حسنِ غزل کو ہم نے — رنگ بھی وہ کہ جسے خونِ جگر کہتے ہیں

تصدق تیرے حسن و سادگی پر — نزاکت، جامہ زیبی، خوش آرائی

رَوش ہم پر محبت میں وہ بیتی — ازل سے بھی جو سننے میں نہ آئی

تجھ سے جدا نہیں ہوں میں تو ہے جہاں وہیں ہوں
ہاں تیرا ہمنشیں ہوں میں محفلِ کائنات میں

جو کہنا تھا ہم کہہ کے اُٹھ بھی گئے — مگر نقشِ حسنِ بیاں رہ گیا

جب وہ خود اپنے تغافل سے پشیماں ہونگے — ہم نہ اس دن کیلئے لے شبِ ہجراں ہونگے

استخواں خاک ہوئے، خاک ہوئی خاکستر
دل میں اب تک ہے درِ شوق کھلا تیرے لئے

آہ کیوں تجھکو بھلانے کی قسم کھائی تھی — کتنے مجبور ہیں اے دوست تری یاد کے ہم

میں وہ رسوائے خراباتِ محبت ہوں روشؔ — کہ مرے نام سے اکثر درِ میخانہ کھلا

ہائے وہ غم روشؔ کہ جس غم کا — رنگ ملتا ہو شادمانی سے
فرصتِ مرگِ ناگہاں بہتر — کاوشِ عمرِ جاودانی سے

زندگی تو ملی مگر یارب — چارۂ دردِ زندگی کیا ہے

ایک ہی پیغام ہے شیخ و برہمن کے لئے — عظمتِ انساں سے ہے دیر و حرم کی آبرو

سایۂ گیسوئے ساقی کا تصرف ہے روشؔ — تا جنوں انگیز اتنا دورِ پیمانہ کہاں

ایک بتِ نامہرباں سے دوستی کرلی روشؔ — اب تو یہ ضد ہے کہ ہم پر مہرباں کوئی نہ ہو

اور واقعی روشؔ کسی کی مہربانی کی پروا کئے بغیر مشاعرے میں غزل پڑھنے کے بعد والہانہ تصورات میں کھوئے ہوئے عالمِ مجاز سے گذر کر حقیقت سے جا ملے اور ان کا یہ شعر جو انھوں نے کئی سال پہلے کہا تھا، گویا ان پر الہام حق تھا۔

ہمیں رسمِ سفر آئی نہ اندازِ قیام آیا
نہ جانے ہم کہاں ہوں گے اگر ان کا پیام آیا

جمیل مہدی

۸

روش — شاہد عزیز روش صدیقی جوالاپوری، حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کی درمیانی کڑی تھے، اقبال کے بعد جوش و جگر کی شاعری نے مجموعی طور پر جو رنگ و آہنگ اردو شاعری کو ودیعت کیا اس کی جھلکیاں ان تینوں شاعروں کے کلام میں ملتی ہیں، روش اردو شاعری کی تمام روایتوں کے وارث بلکہ محافظ بن کر بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں، یہ مقام انھیں طبعی شرافت، کھلی آب ہوا اور قصباتی سادگی اور بے ریائی کی بدولت ملا تھا، وہ شہروں کی مصنوعی اور رسمی زندگی اور تکلفات کی طرف آخر وقت تک راغب نہ ہو سکے، ان کی طبیعت میں جو سادگی، خلوص، دریاؤں کی سی سیرچشمی اور میدانوں کی جو وسعت تھی وہی ان کی شاعری میں کارفرما نظر آتی ہے، ان کی شاعری پر رومان اور انقلاب کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں، ان کا آہنگ اور فکر و خیال کا سرچشمہ وہی ہے جو اس زمانے کے نوجوان شاعروں حفیظ، ساغر، احسان اور تاثیر کی شاعری میں رواں دواں نظر آتا ہے، وہ کلاسیکل فارسی اور ہندی شاعری پر بھی گہری نظر ڈال چکے تھے اس لئے ان کے ذہنی پس منظر میں کتنے ہی رنگوں اور بوقلموں فضاؤں کی جھلکیاں بھی دکھائی دے جاتی ہیں، غزلوں اور نظموں پر انھیں یکساں طور پر قدرت حاصل تھی، فارسی ترکیبوں اور اضافتوں کے استعمال کا ہنر بھی انھیں معلوم تھا اور شاید شوق بھی بے حد تھا، اس شوق نے ان کی آواز، لہجے اور شاعری کی سطح اور فضا کو اتنی ہمواری اور توازن سے آشنا

کر دیا تھا کہ پستی اور بلندی کا فرق ہی درمیان سے اُٹھ گیا تھا۔

حسرت موہانی کے بارے میں نیاز فتحپوری نے ایک جگہ کہا ہے کہ ان کا لہجہ کبھی پست و بلند نہیں ہوتا، تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات رَوش صدیقی کی غزل کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، تھوڑا فرق اس لئے کہ وہ حسرت کی مانند صرف غزل کے ہی شاعر نہیں تھے، ان کی نظموں میں کچھ ایسے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو حسرت کی شاعری میں موجود نہیں تھے، تاہم انھوں نے نظم کو بھی ضبط و توازن کی حدود سے آگے نہیں جانے دیا، وہ حسرت کی طرح نظم کو بھی غزل کے سانچے میں ڈھال کر کہنے کے عادی نہیں تھے ان کی نظموں اور غزلوں میں فرق کیا جاسکتا ہے، حسرت نے "شان رسوائی کا جو اعتبار" اردو شاعری میں پیدا کیا تھا وہ 'تہذیب رسم عاشقی' کی بدولت ہی ممکن ہوسکا تھا۔

رَوش اپنی غزل کے مزاج کے اعتبار سے حسرت سے قریب بھی ہیں اور متاثر بھی معلوم ہوتے ہیں، 'محراب غزل' میں انھوں نے صرف ایک ہی شاعر کا نام لے کر اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور وہ حسرت موہانی ہیں

رَوش یہ خوش آہنگ رنگ غزل
دل آویز ہے رنگِ حسرت کے بعد

شاید حسرت کی ہی تقلید میں انھوں نے اپنی شاعری کی حدود مقرر کرلی تھیں، لہجہ مقرر کرلیا تھا، آہنگ، انداز اور معیار متعین کرلیا تھا، عمر بھر وہ اس ڈگر سے نہیں ہٹے، تعجب اور حیرت کی بات یہ تھی کہ عمر بھر انھوں نے بڑے سلیقے اور کامیابی کے ساتھ اسے نباہ دیا، حسرت کی مانند ہی ان کی شاعری پر بڑی شریفانہ فضا اور علوئے خیال کے تاثرات چھائے ہوئے ہیں، ان کی زندگی اخلاق کے اعلیٰ اور مشکل سے مشکل معیار پر پوری اترتی ہے، اس اخلاق اور اعلیٰ خیالات کا بڑا خوبصورت آمیزہ ان کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے، انھوں نے اپنی پوری شاعری میں شاید ایک بھی غیر مہذب غیر معیاری اور رکیک

لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ اسے نت نئی نادر ترکیبوں اور تشبیہوں سے ہمیشہ دلآویز اور نشاط انگیز بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ خیالات کے پیچ در پیچ بہاؤ اور جذبات کی تہہ در تہہ لرزشوں کی بدولت ان کی شاعری میں بڑی تاثیر، دلکشی اور کلاسیکل شان پیدا ہوگئی ہے، اور اردو شاعری کے بہترین عناصر سمٹ کر ان کی شاعری خاص طور پر غزلوں میں آگئے ہیں۔

وہ غزل کے لب ولہجہ اور اس ضبط و توازن کی ضرورت سے بخوبی آشنا تھے جس کے بغیر غزل کی عظمت اور طہارت، تاثیر اور آفاقیت باقی نہیں رہتی، نگاہوں کے زخم، خارجی تاثرات، اندرونی کرب اور برشتگیٔ درماندگی ان کے محسوسات پر جا ہے جتنی شدت کے ساتھ اثر انداز ہو اس کا اظہار بڑے متوازن اور باوقار انداز میں ہوتا ہے، زندگی نے انھیں خوشیاں کم دیں، اور محرومیاں اور غم زیادہ لیکن ان کی رجائیت اور نشاط پسندی نے کبھی اور کسی مرحلہ پر بھی انھیں بے قابو نہیں ہونے دیا لیکن وہ

کہاں پہونچ کے لٹا کاروانِ مہر و وفا
کہ دوستی سے بہت دور دشمنی نہ رہی

ترے عہد میں کیوں مٹایا گیا
وہ حرفِ محبت جو باطل نہ تھا

خیال و خواب تمھارے ہم نشیں، فسانہ تھا
نہ ہم چمن میں کبھی تھے، نہ آشیانہ تھا

اور

کنارِ درد میں نیند آگئی محبت کو
ہوئے تمام فریبِ سکوں کے افسانے

کی حد تک بے تابو شاذ ہی نظر آتے ہیں، کبھی کبھی ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور جہدِ زندگی کے سامنے ہمت ہار بیٹھیں، ان کی شاعری مجبوری طور پہ بے خودی

و سرشاری، حوصلوں، ولولوں، امیدوں اور مشکل پسندیوں کی شاعری ہے، ناسازگار اور تکلیف دہ حالات میں بھی مسکرانے کی ہمت ان کے پاس تھی اور اس کا ثبوت انھوں نے ہر اہم موڑ اور اپنی زندگی کے نازک سے نازک مرحلہ پر دیا ہے، ان کی آنکھوں کے سامنے نہ صرف ان کا اپنا گھر فساد اور آتش زنی کی نذر ہو گیا بلکہ جوالاپور کی وہ بستی ہی ہمیشہ کے لئے اجڑ کر رہ گئی جس کے قدرتی مناظر اور کھلی فضا نے ان کی شاعری کو وسعت اور رنگا رنگی سے آشنا کیا تھا، وہ تمام عمر اس سرزمین سے دور مہاجروں کی سی زندگی بسر کرتے رہے جس کی گود میں انھوں نے آنکھ کھولی اور اپنی شاعری کے بہتر عناصر مستعار لئے تھے لیکن ان کے لہجہ پر ذرا بھی اس محرومی اور تلخی کا سایہ نہیں پڑا جس کی تپش اور دھویں سے آخر عمر تک ان کے سینے میں گھٹن پیدا ہوتی رہی۔

وہ نشاط و الم کے فلسفہ سے بخوبی واقف اور اس کی حقیقتوں اور محرکات کے محرم تھے، تصوف کی پناہ جو کم از کم اردو شاعروں کو تو اکثر بے راہی اور مایوسی، قنوطیت اور فرار سے محفوظ کرتی رہی ہے، ان کے لئے بھی بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی، بلند مشربی اور وسیع النظری کی بدولت وہ ہمیشہ نفرت، تنگ دلی اور غیظ و غضب کے جذبات سے ماوراء بنے رہے، ان کی انسانیت اور انسان دوستی کے جذبہ میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، وہ شیخ و برہمن کی کشمکش سے تو آگاہ تھے، اس کشمکش کے ناگوار نتائج کا مشاہدہ بلکہ سامنا بھی انھیں کرنا پڑا تھا مگر وہ اس کشمکش کے فریق بننے پر کبھی تیار نہیں ہو سکے بلکہ

ہم کو شکوہ تو نہیں شیخ و برہمن سے مگر
بے غرض کفر ہی ان کا ہے نہ اسلام ان کا
جام و مینا سے الجھتے ہیں جو مے خوار روش
مسلک بادہ پرستی ہے بہت خام ان کا

ان کی شاعری کا عنصر، حال کی ساری کلفتوں کو مسکراہٹوں میں تحلیل کرتے رہنے کا عزم مصمم، زہر پینے اور امرت اگلنے کی حوصلہ آزما لیکن کام یاب کوشش، سیلاب رنگ و نور میں نہائی ہوئی افکار و تخلیق کی نیرنگیوں کے ہجوم میں ان کا پیکر سنگ مرمر کا تراشا ہوا حسین پیکر معلوم ہوتا ہے، دکھوں، زخموں اور مایوسیوں کا بوجھ اٹھا کر ایک بڑا دماغ ہی اس طرح سوچ سکتا اور ایک بڑا دل ہی مسکرانے کی ہمت دکھا سکتا تھا۔

ہم بے نیازِ جادہ گری ہیں کہ عشق نے
درماں کو درد، درد کو درماں بنا دیا

یہ ہے دورِ جلالِ ابنِ آدم
نہ سلطانی نہ خاقانی کے دن ہیں

حرم تک روشنی ہی روشنی تھی
ہم اس عالم میں مے خانے سے نکلے

یہ حادثے کہ جو اک اک قدم پہ حائل ہیں
خود ایک دن ترے قدموں کا آسرا لیں گے
بہت غیور ہیں آشفتگانِ زلفِ نگار
کبھی تو گردشِ دوراں کے بل نکالیں گے
زمانہ چیں بہ جبیں ہے تو بات کیا ہے روش
ہم اس عتاب پہ کچھ اور مسکرا لیں گے

اور

آنکھوں میں اب آ نہ جائیں آنسو ہم دیر سے ان کو تک رہے ہیں

کے پیچھے کرب و اضطراب اور حوصلہ مندیوں کی جو کشمکش ہے وہی رَوِش کی شاعری کا امتیاز بھی ہے اور ان کی شاعری کی بنیاد بھی، انھوں نے جس انداز اور طنطنہ کے ساتھ زندگی کے ساتھ معاملت کی، جس طرح انھوں نے شاعر کے منصب کو شاعری کے فن میں برتا اور استعمال کیا، جس طریقے نغمۂ فردا کے مغنی اور یقین و عزم کے نقیب بنے رہے، جس طرح انھوں نے طہارت نفس اور صدق و صفا کے قلب کو کردار اور گفتار سے ہم آہنگ رکھا، اور پھر جس طرح وہ اسفلی جذبات سے گریزاں اور آفاقیت کے ترجمان بنے رہے، وہ اردو شاعری اور شاعروں کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ زندگی بھر وہ ضرب المثل میں داخل اپنے اس شعر کی تفسیر بنے رہے۔

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

آخر میں وہ ایک شعر بھی سن لیجیے، جسے میں نے ہمیشہ اپنے حسب حال پایا اور زندگی کے کتنے ہی مرحلوں میں تسکین دہ محسوس کیا ہے۔

اب شیخ و برہمن سے رَوِش دل نہیں ملتا
کیا کیجیے کافر ہیں نہ دیندار ہیں ہم لوگ

ڈاکٹر عبدالوحید

(۹)

حضرت رَوش جدید شعریت کے پیرو ہیں اور عصرِ حاضر کے رومانی شعراء میں انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہوئے، لیکن ان کی غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صنف میں بھی اچھے شعر نکال لیتے ہیں۔ تاہم چونکہ پوری توجہ نظم نگاری کی طرف ہے، اس لیے غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ پیدا نہیں ہوسکا اور نہ ہی اس میں وہ پورے طور پر اپنے آپ کو واضح کرسکے ہیں[1]۔

رَوش صاحب کے کلام کو دیکھ کر ان کے متعلق یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ سرتاپا احساس ہیں۔ بعض اوقات یہ احساس الفاظ کی صورت میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے، مگر ان ٹکڑوں میں اصل کی کچھ جھلک اور ایک حسن ضرور ملتا ہے۔ ان کی منظومات رعنائی خیال، شیرینی اور

---

[1] "جدید شعرائے اردو" سے، جس کے چیف اڈیٹر ڈاکٹر عبدالوحید صاحب ہیں، یہ مضمون تلخیص کرکے شائع کیا جارہا ہے۔ اس مضمون کے آخری حصے سے جو حذف کردیا گیا ہے، پتا چلتا ہے کہ یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب رَوش مرحوم کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔ ابتدا میں بعض بلکہ بیشتر ناقدوں کا خیال تھا کہ مرحوم کی غزل میں وہ بات نہیں ہے جو ان کی نظموں میں ہے، مگر بعد میں ان کے خیالات بدل گئے، ممکن ہے ڈاکٹر عبدالوحید صاحب کا خیال بھی اب وہ نہ ہو جو ان کی غزلوں کے بارے میں اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے۔ عبداللطیف اعظمی

ترنم کے لیے خاص طور پر معروف ہیں۔ شکل و ہیئت کے اعتبار سے رَوش صاحب کی نظمیں ان کی شاعرانہ ذہنیت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں اور ان میں ان کے جذبات، احساسات اور خیالات کے پیچ و خم کا اظہار بھی بخوبی ہوجاتا ہے، بالخصوص ترجیع بند کے انداز کی نظموں میں جہاں وہ ایک مصرعہ کو بار بار لاتے ہیں، ان کے طرز بیان میں ایک خاص حسن و دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔

جناب رَوش کی نظم نگاری کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب رقم طراز ہیں:

"رَوش اپنی رومانیت میں اتنے گم ہیں کہ ان کے اقلیم سخن سے منظر نگاری یا واقعہ نگاری عموماً دور رہتی ہے۔ رَوش کی شاعری بنیادی طریقے سے دورِ جدید کی پیداوار ہے اور طبقہ متوسط کو اپنی رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑتی ہیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے رَوش کے یہاں بیان ہوجاتی ہیں۔"

اس کے علاوہ ان کی نظموں میں سیاسی و سماجی جکڑبندیوں پر بھی اظہار خیال ہوا ہے، لیکن ان کے سیاسی تصورات میں وہ بیداری وزور اور ایسی گرج اور چمک نہیں پائی جاتی جو جوؔش، مجاؔز یا فیضؔ وغیرہ کے یہاں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان مسائل کو رومانیت کے نظریے کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور رومانی عنصر کے غالب ہونے کے باعث سیاسی حقیقت ایک ادائے بازگشت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے دورِ حاضر کے سیاسی و سماجی مسائل کو اپنی منظومات میں جگہ دی ہے۔

حضرت رَوش کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ان کا تغزل اور روانی

ہے اور ان خصوصیات کے تحت ان کی اکثر نظمیں بہت ہی قابل قدر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک رومانی نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانیٔ احساس جھکی جاتی ہے
حیرتِ عالم امکاں کو خبر ہے شاید

اس ایک بند سے ہی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے رنگ سخن میں تغزل کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں کم لوگ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں بلا کی دل نشینی ہے اور اس دل نشینی میں نرم، لطف اور مترنم الفاظ و تشبیہات کی بہتات اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ تغزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
ہائے اُس بے خودی کو کیا کہیے
ہے وہی رنگ حسن بے پروا
عشق کی سادگی کو کیا کہیے
کھینچ لے جائے جو ترے در تک
ایسی دیوانگی کو کیا کہیے
اُن پہ قربان ہستیٔ کونین
ایک میری نظر کو کیا کہیے

منظوم خراج عقیدت

یحییٰ اعظمی

(۱)

اے رَوِش اے نغز گفتار و خوش آدابِ غزل
اے رَوِش اے زمزمہ پرواز "محرابِ غزل"
تیری رحلت سے حزیں ہے روئے شادابِ غزل
ایک تیرے دم سے باقی تھی تب و تابِ غزل
نظم گوئی پر بھی قدرت تھی تجھے یکساں، مگر
سازِ فطرت تیرا تھا بیتاب مضرابِ غزل
تجھ پہ جب ہوتے تھے اسرارِ حقیقت بے حجاب
تیرے خامہ سے ابلتی تھی مئے نابِ غزل
عارضِ تازہ ترا حسنِ تغزل کی بہار
چہرۂ زیبا ترا رخسارِ شادابِ غزل
وہ رَوِش ہر ہر رَوِش پر جس کی شعریت نثار
تھی جبیں پر جس کی رقصاں موجِ بیتابِ غزل
فکر و دانش کو دیئے شائستہ اسلوبِ نظر
دورِ حاضر کو سکھائے جس نے آدابِ غزل

ہر نفس جس کا تھا سرشارِ مئے حسنِ ازل
ہر نظر جس کی تھی مستِ بادۂ نابِ غزل
عصرِ حاضر سے جدا تھا جس کا اندازِ بیاں
منفرد تھا جس کا طرزِ فکر در بابِ غزل
اصغر و اقبال باقی تھے نہ فانی و جگر
اٹھ گیا وہ بھی کہ تھا منجملہ اربابِ غزل
بزمِ خاصانِ ادب میں ہے صفِ ماتم بپا
رو رہے ہیں آہ اس کو آج اصحابِ غزل
عندلیبِ شعر سے خالی گلستاں ہو گیا
رخصت اب بزمِ غزل سے وہ غزلخواں ہو گیا

مخمور سعیدی

(۲)

فرازِ آسماں پر صبحدم کتنا اُجالا تھا
افق کے آئنوں میں تازہ دم سورج کی کرنیں مسکراتی تھیں
فضا کو گدگداتی تھیں
کرن، اک اک کرن مضرابِ سازِ نور تھی گویا
پرندے شاخساروں میں چہکتے، چہچہاتے تھے
سہانے گیت گاتے تھے
بھرا تھا آسماں نغماتِ جاں پرور کی تانوں سے

پرندوں کی اڑانوں سے

گزرتے وقت کا سایہ
غرورِ خود نمائی سے پرے، سر در گریباں تھا
پشیماں تھا

مگر اب دمبدم منظر بدلتا جا رہا ہے
ہو رہا ہے آسماں خالی
فضا کے آئینوں میں جتنے روشن عکس تھے، سب بجھتے جاتے ہیں
اجالوں کو تھکا مارا ہے دن بھر کی مسافت نے
پرندے خستگی کا زخم کھا کر...
شام کی اندھی گپھا میں گرتے جاتے ہیں
گزرتے وقت کا تاریک سایہ چاروں جانب بڑھتا جاتا ہے
اندھیری رات خالی آسماں کی وسعتوں پر چھاتی جاتی ہے
خموشی بڑھتی جاتی ہے

قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

(۳)

تاجدارِ علم و فن رخصت ہوا
شاعری کا بانک پن رخصت ہوا
اُڑ گیا وجدان کا مخصوص رنگ
شوق کا دیوانہ پن رخصت ہوا

پیکرِ اخلاقِ عالی چل بسا
آدمیت کا چلن رخصت ہوا

جس کے گُل تھے علم و عجز و انکسار
وہ شرافت کا چمن رخصت ہوا

سب گلوں پر سوگ جس کا چھا گیا
کون ایسا گلبدن رخصت ہوا

جس پہ نازاں تھے سبھی اہلِ سخن
آہ وہ جانِ سخن رخصت ہوا

انجمن کی انجمن ہے سوگوار
آج صدرِ انجمن رخصت ہوا

دوستی جس کی رہی آلام سے
جو رہا وقفِ محن رخصت ہوا

جس نے ٹھکرایا امارت کا جہاں
تھا جو غربت میں مگن رخصت ہوا

غیر کا شرمندۂ احساں نہیں
اوڑھ کر اپنا کفن رخصت ہوا

جس نے گایا نغمۂ حبِّ وطن
وہ وطن میں بے وطن[1] رخصت ہوا

شاعرِ مشرق، فدائے لوالکلام
وہ روشؔ، وہ شاہِ فن رخصت ہوا

---

[1] حضرت روشؔ صدیقی ۴۷ء کے خونیں دور میں اپنے وطن قصبہ جوالاپور ضلع سہارنپور سے لٹ پٹ کر نکلے تھے جس کے بعد سے تادمِ آخر وہاں آباد نہیں ہو سکے۔
(حافظ)

بشیر صدیقی انبالوی

(۴)

اٹھ گیا وہ صاحبِ شعر و سخن
جس نے سمجھے معنیٔ دار و رسن

جس نے سمجھی عظمتِ دیر و حرم
معتبر جس کے لیے شیخ و صنم

صوفی و ملاؔ کا جب کرتا بیاں
چشمِ ظاہر پر تصوف تھا عیاں

رند و زاہد کی جو ہوتی داستاں
میکدے کا سامنے آتا سماں

واقفِ شرعِ متیں تھا نیک خو
جس نے سمجھے معنیٔ لاتقنطو!

باغِ ہستی میں رہا ایسا چلن
ہر روش ہر روز و شب تھا گامزن

عشق کی رہتی تھی دل میں کچھ کسک
رُخ سے ہر لحظہ عیاں جس کی جھلک

نطق شیریں تھا سخن معجز اثر
فکر کا تھا عرش پر جس کی گذر

جس طرح کردار تھا جامع سفات
ہر سخن میں اس کے پنہاں تھے نکات

ہو گیا گل وہ ادب کا اک چراغ
تھا روشؔ جو شاعرِ روشن دماغ

شستہ گو اس دور میں اس سا کہاں
ناز جس پر خود کرے اردو زباں

نازشِ اردو زباں ہائے روشؔ
چل دیا سوئے عدم دے کر خلش

لینے کیا آئی روشؔ کو تھی اجل
کر گئی تاراج دنیائے غزل

عشق کا مقصود تھا وصلِ خدا
جاں بحق ہو کر ملا یہ مدعا

دل نشیں کچھ نام تھا شاہد عزیز
اس پہ فن نے کر دیا ہر دل عزیز

کر دعا حق میں روشؔ کی اے بشیرؔ
نورِ ایماں سے لحد ہو مستنیر

قطعات وفات

وائے قسمت کہ آج اس کے بجائے
زندگی اس کی بر رضائے خدا

میں نے تاریخِ انتقال کہی
ہو گئی، نذرِ خوابِ نیم شبی

۱۹۷۱ء

انھیں دیکھا کروائے شوق جذب قلب مضطر میں
روش کب کے گئے، پہونچے مقامِ قربِ داور میں
سرِ جنت سے بہرِ سالِ رحلت یہ ندا آئی
کہ سو آرام سے یادِ خدا، حُبِ پیمبر میں

۳ + ۱۳۸۷ = ۱۳۹۰ ہجری

محمد مظہر جلیل شوق (کراچی)

اُٹھ گیا اُف روش سا اہلِ سخن
اے قمر لکھ یہ مصرعِ تاریخ

بزمِ اردو سیاہ پوش ہوئی
آہ شمعِ ادب خموش ہوئی

۱۳۹۰ھ

قمر سنبھلی

شستہ گو، پختہ نظر، رنگیں مزاج
نازشِ اردو زباں، ہائے روش

سنگ میں دیکھے نظر جس کی زجاج
اٹھ گیا وہ "شاعرِ خوددار آج"

۱۳۹۰ھ

بشیرالدین صدیقی انبالوی

لوحِ تربت رَوش صدیقی

۷۸۶

خدا جانے یہ مطلع کب کہا تھا اپنی رحلت پر
وہی سب "ماجرا" دیکھو پئے تاریخ کام آیا
۲۴۵
شوق
"ہمیں رسمِ سفر آئی نہ اندازِ قیام آیا
نہ جانے ہم کہاں ہوں گے اگر ان کا پیام آیا"

۱۷۲۶ + ۲۴۵ = ۱۹۷۱ء

رَوش

کہو، اعجاز! لبِ آہ سے تاریخِ وفات
مشعلِ بابِ سخن نام رَوش صدیقی

۱۹۷۰
+۱
۱۹۷۱ء

اعجاز صدیقی

نام : شاہد عزیز تخلص : رَوش
ولادت : ۱۰ر جولائی ۱۹۰۹ء وفات : ۲۳ر جنوری ۱۹۷۱ء

روشؔ مرحوم کے نثری نمونے

روشؔ مرحوم جہاں بہت اچھے شاعر تھے، وہاں بہت اچھے نثر نگار بھی تھے مگر بدقسمتی سے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کے کاغذات میں چند مضامین ملے ہیں جو نامکمل ہیں اور شاید ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں ریڈیو کے لئے لکھے گئے تھے۔ نمونے کے طور پر یہ نامکمل مضامین ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

سیّد انشؔا

سیّد انشاء اللہ خاں، سید ماشاء اللہ خاں مصدرؔ کے خلف الرشید، مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنی ذہانت، جودتِ طبع اور وسعتِ علم وفن کے اعتبار سے اردو کے ممتاز شعرا میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم اور ترکی زبان کے ماہر تھے۔ برج بھاشا کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ظرافت پسندی اور شوخ طبعی ان کے کمالات کا حجاب بن گئی۔ پھر بھی جہاں وہ آدابِ غزل کے ساتھ سخن طراز ہوئے ہیں، ان کی شاعری حسنِ تاثیر اور دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کے یہاں ایسی غزلوں کی کمی نہیں، جن زمینوں میں اُن کے معاصرین نے بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن انشؔا کی غزلیں سب پر بھاری نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک بہت مشہور غزل ہے، جس کا مقطع ہے:

نزاکت اس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشؔا
نسیم صبح جو چھُو جائے، رنگ ہو میلا

اس زمین میں مصحفی اور جرأت کی غزلیں بھی ہیں، لیکن انشا کی غزل تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ وہ قیامت خیز غزل کس نے نہیں سُنی، جس کا ایک غیر فانی شعر ہر صاحب ذوق کو کبھی کبھی ضرور یاد آتا ہے:

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

سیّد انشا کے دیوان غزل کا اگر سلیقہ سے انتخاب کیا جائے تو اس میں اچھے اشعار کی تعداد کچھ کم نہ ہوگی۔ ہر رنگ میں انشا نے کہا ہے اور اس طرح کہ اُن کی بلندی کمال کا اعتراف کئے ہی بنتی ہے۔ انشا نے اردو نثر میں بھی اپنا اسلوب الگ نکالا۔ "رانی کیتکی" کی داستان بہت سادہ اور شگفتہ اُردو میں ہے، جس میں ہندی الفاظ بڑے حسن کے ساتھ کھپائے گئے ہیں۔

اُن کے منتخب غزلیہ کلام میں جو سوز و تاثیر ہے، اس کا اعتراف ہر زمانے میں کیا جاتا رہا ہے اور اہلِ ذوق ان کے اشعار سُن کر سر دھنتے رہے ہیں۔

آتش

خواجہ حیدر علی آتش لکھنؤ کے گلستانِ شاعری میں گُلِ سر سبد کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا خاندانی سلسلہ حضرت خواجہ عبد اللہ احرار تک پہنچتا ہے، جو سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک ممتاز بزرگ تھے۔

آتش کے اسلاف کا وطن بغداد تھا، لیکن ترکِ وطن کر کے یہ خاندان شاہجہاں آباد دہلی میں آباد ہو گیا۔ آتش کے والد ماجد خواجہ علی بخش، شجاع الدولہ کے زمانے میں دہلی سے اُٹھ کر فیض آباد میں جا بسے۔ آتش یہیں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ سال ولادت ۱۱۹۲ھ ہے۔

آتش کی تعلیم باقاعدہ مکمل نہ ہو سکی۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں ان کے علم و فضل کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس کمی کا ذکر کیا ہے۔ آزاد کا نظریہ کوئی اہمیت

نہیں رکھتا۔ شاعر، سچ یہ ہے کہ تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔ علومِ رسمیہ کی تحصیل وتکمیل سے سونے پر سہاگہ تو کہی جاسکتی ہے، لیکن خود سہاگہ سونے کا مرتبہ حاصل نہیں کرسکتا۔

بعض الفاظ خواجہ آتش نے عربی فارسی تلفظ سے مختلف استعمال کئے ہیں۔ یہ بات محلِ اعتراض نہیں۔ اردو میں عربی فارسی کے صدہا الفاظ اپنے اصل تلفظ سے کچھ مختلف اعراب کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کو فصیح سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں لفظ موسِم ہے لیکن اردو والے موسَم کہتے اور لکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا شباب تھا (جب) فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے، جن کا آوازۂ کمال دور دور تک پہنچ چکا تھا۔

محاورات اور روزمرہ کی صفائی، نہایت شستہ و شائستہ لب ولہجہ کلام میں تصوف کی آمیزش جو اُن کا ورثۂ خاندانی تھا۔

مومن

حکیم محمد مومن خاں مومن، میر اور غالب کے بعد اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی ندرتِ خیال، جدتِ اسلوب، ان کی نغز گفتاری اور جادو بیانی، تعریف وستائش سے مستغنی ہے۔ اُن کو حالی جیسا کوئی شاگرد ملا ہوتا تو شاید غالب کو وہ قبولِ عام میسر نہ ہوتا۔

ان کے والد ماجد حکیم غلام نبی خاں شرفائے دہلی میں ممتاز تھے۔ مومن ۱۲۱۵ ہجری میں پیدا ہوئے۔ کم سنی ہی میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور عربی زبان میں خاصی قابلیت پیدا کی۔ اس کے بعد اپنے والد اور چچا حکیم غلام حسین خاں سے فنِ طب کی کتابوں کا درس لیا۔ اور کچھ دنوں نسخہ نویسی بھی کی۔ طب کی تعلیم کے سلسلے میں علمِ نجوم میں بھی مہارتِ تامہ بہم پہنچائی۔ زائچہ شناسی اور حکم اندازی میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شعر وسخن

سے مناسبتِ ازلی رکھتے تھے۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، مگر جلد ہی خود اپنے ذوقِ سلیم کو رہنما بنایا۔

مومن نہایت خوش شکل، خوش خیال اور خوش نظر، خوش باش اور خوش وضع انسان تھے۔ معاملاتِ حسن و عشق کی ترجمانی جس لطافت و رعنائی سے مومن کرتے ہیں، وہ ان کے معاصرین میں کسی کو نصیب نہیں۔ مومن جو ازل سے طبع عاشقانہ لائے تھے، ذوق اور غالب سے بہت آگے ہیں۔ جس شوخی، دلآویز متانت اور نزاکتِ احساس کے ساتھ ان واردات کی مصوری کرتے ہیں، اس کا حسن انہیں پر ختم ہو گیا۔

فارسی زبان سے غالب کو ایک ربطِ سرمدی ٹھہرا۔ لیکن مومن نے فارسی تراکیب کو جو اضافت اور نزاکت عطا کی اس کا لطف مرزا غالب سے بھی سوا ہے۔ جدتِ ادا اور ندرتِ بیان کی خوبیوں نے مومن کی صہبائے غزل کو سہ آتشہ بنا دیا۔ مومن، جلوت و خلوت میں عاشق ہی نظر آتے ہیں غالب کی حکیمانہ فلسفہ آرائی ان کے یہاں معدوم ہے، کاروبارِ عشق سے انہیں اتنی فرصت کہاں تھی۔

مومن کی شاعری میں جادوگری کا سا عالم ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس خوبی و دلکشی کے ساتھ کہ سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ مومن کے دیوان کا ہر صفحہ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست، کا مصداق ہے۔ کوئی غزل ایسی نہیں جس میں ایک دو شعر ایسے نہ مل جائیں کہ پڑھنے والا دل پکڑ کر رہ جائے۔

صدہا اشعار میں سے چند ملاحظہ ہوں :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　مجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

نہ مانوں گا نصیحت، پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں　　اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

ریاض خیرآبادی

اردو غزل کے چار ستون اپنی جگہ قابلِ تسلیم۔ کون ہے جو فانی، اصغر، حسرت، اور جگر کے اس امتیاز کا معترف نہیں۔ لیکن ریاض خیرآبادی کی انفرادیت ان میں ایک پانچویں ستون کا اضافہ کرتی ہے۔ ریاض سے اردو غزل کو ایک نیا حسن، نیا اندازِ فکر اور نیا اسلوبِ اظہار ملا، کچھ نقاد ان کو اردو کا خیام کہتے ہیں۔ اور ریاض کی انتہائی لطیف و پاکیزہ سرمستیٔ خیال اشارہ کرتی ہے کہ یہ تشبیہ ایک حد تک درست ہے۔

امیر مینائی بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کو ایسے شاگرد ملے جو خود اپنی جگہ صاحبِ طرز اساتذہ کی صف میں شامل ہیں۔ ان شاگردوں میں گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے ریاض بہت بلند اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ایک شیوہ بیان اور جادو طراز شاعر بھی تھے اور ایک خوش فکر اور خوش نظر نقاد بھی۔ جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجے کے ادیب اور انشاپرداز بھی تھے۔ اردو ادب کے لئے ان کی بے شمار خدمات کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ علم و فن کی اس بلندی کے ساتھ انتہائی خلیق، متواضع، محبت شعار اور خودداری و سیر چشمی میں اُن کا جواب نہ تھا۔ اردو ادب کے ایک بہت بڑے نقاد نے پہلے پہل ان کو دیکھا تو بے اختیار کہہ اُٹھے کہ بے شک یہ ایک باوقار فرشتہ ہے۔

ریاض کی ولادت قصبہ خیرآباد ضلع سیتاپور میں ہوئی جو خطۂ اودھ میں

شرفا کی ایک قدیم بستی ہے۔ سال ولادت ۱۸۵۴ء ہے۔ ان کا خاندانی سلسلہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔

ریاض کے والد ماجد سید طفیل احمد اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ خاندان میں یہ پہلے شخص تھے کہ جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ سید طفیل احمد آگرہ میں کوتوال شہر رہے۔ یہ خاندانی روایت ان کے بعد بھی جاری رہی۔ خود ریاض اور ان کے بھائی سید نیاز احمد دونوں کا تعلق پولیس کی ملازمت سے ہوا۔ ریاض تو جلد ہی ملازمت کی ذمہ داریوں سے دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے۔ لیکن سید نیاز احمد نے بڑی ترقی کی۔ ریاست بھوپال میں پولیس کے اعلیٰ افسر ہو کر انھوں نے پنشن پائی۔

ریاض نے فارسی اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی کی تکمیل سید الٰہی بخش مرحوم کے مدرسۂ عربیہ میں ہوئی۔ شاعری کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے ہی نشوونما پا رہا تھا۔ اس زمانے میں سید مظفر علی اسیر کا شہرہ عام تھا۔ یہ بھی اسیر کے شاگرد ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد خود اسیر کے مشورے سے امیر مینائی کا تلمذ اختیار کیا، جن کی شہرت و مقبولیت خود ان کے استاد اسیر سے بھی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

ریاض کو اپنے استاد امیر مینائی سے کمال درجے کی عقیدت و محبت تھی۔ امیر بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کا احترام و وقار دوسرے تمام شاگردوں سے زیادہ اُن کے دل میں تھا۔ ۱۸۷۲ء میں ریاض نے خیرآباد سے ہی ایک ہفتہ وار "ریاض الاخبار" کے نام سے جاری کیا۔

اردو صحافت میں "ریاض الاخبار" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اخبار کا علمی و ادبی معیار دوسرے اخبارات کے لئے ایک روشن نمونہ تھا۔ کچھ دنوں کے بعد "گلکدۂ ریاض" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا۔ یہ اردو زبان کا

پہلا باوقار رسالہ تھا جس میں اساتذہ اور والیانِ ریاست کی طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۸۸۱ء میں ریاضؔ خیرآباد سے گورکھپور پہنچے، جہاں ان کے والد کورٹ انسپکٹر تھے۔

گورکھپور کا قیام ریاضؔ کی داستانِ حیات کا سب سے زیادہ اہم اور رنگین و دلآویز باب ہے۔ یہاں ان کی زندگی کے کم و بیش چالیس سال گزرے۔ گورکھپور کی محبت نے خیرآباد کو بھی بھلا دیا تھا۔ اہلِ گورکھپور کو بھی ریاضؔ سے بلا کی محبت و عقیدت تھی۔ بقول اعجازؔ مشرق "گورکھپور خوش رنگ و خوشبودار پھولوں کا ایک خیابان تھا تو ریاضؔ کی حیثیت اس خیابان میں بلبلِ شیراز کی سی تھی۔ جوان ہوں یا بوڑھے، گورکھپور کا کوئی خوش ذوق ایسا نہ تھا کہ ریاضؔ کے بغیر ایک دن بھی گزارنا پسند کرتا ہو۔ اس محبت افروز تعلق کا ذکر بڑے لطف و کیف کے ساتھ خود ریاضؔ نے اپنے اشعار میں کیا ہے کہتے ہیں :-

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور

"فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" گورکھپور سے جاری کئے، جن کی شوخ و دلآویز خوشبو ہمیشہ مشامِ اردو کو معطر رکھے گی۔

رامپور اور حیدرآباد کے فرماں روا ریاضؔ کے بڑے مشتاق رہے ایک دو بار ریاضؔ رامپور اور حیدرآباد گئے بھی، لیکن گورکھپور کی محبت ہر مصلحت پر غالب رہی اور وہ گورکھپور کے سوا کسی کے نہ ہوئے۔

امرائے ملک میں مہاراجہ محمود آباد اور مولوی سبحان اللہ رئیس گورکھپور سے جو تعلقات اُن کے رہے وہ کمالِ اخلاص و محبت پر مبنی تھے۔ مہاراجہ صاحب

اور مولوی سبحان اللہ دونوں ریاض کی خوبیوں کے بڑے دلدادہ و وارفتہ تھے۔ ریاض نے بھی عمر بھر اس تعلق کو وضع داری کے ساتھ بتایا۔

ریاض کے تغزل میں خمریات کی بڑی شہرت و اہمیت ہے شراب کے موضوع پر اُن کے اشعار تاثر و دلآویزی میں لاجواب ہیں۔ حالانکہ ریاض ایک زاہد مرتاض کے سوا کچھ نہ تھے۔ ایک قطرہ بھی چکھنا تو الگ رہا اُسے چھونا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے بڑے خوش ذوق پابند، حج کے لئے ایسے مشتاق کر (یہ مضمون یہیں ختم ہوگیا ہے۔ یا تو آگے لکھنے کا موقع نہیں ملا یا بعد کے صفحات ضائع ہوگئے۔ عبارت صفحے کے بالکل آخر تک ہے۔)

حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی کی یاد کے ساتھ ایک باعظمت انسان کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ سادگی و شرافت، اخلاص و محبت، حریتِ فکر و آزادی خیال، ذوقِ عاشقی اور عرفانِ جمال کی خوبیوں کا ایک مرقع۔ انھیں عقیدت و محبت سے امام المتغزلین بھی کہا گیا اور رئیس الاحرار بھی۔ لیکن اُن کی عظیم شخصیت اِن حدود میں بھی محدود نہیں۔ وہ ان کاملینِ زمانہ میں سے تھے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

آزادی کا جذبہ اور شاعری کا ذوق۔ مولانا روزِ ازل سے ساتھ لائے تھے۔ وادیٔ خیال اور میدانِ عمل دونوں سے اُن کا تعلق عاشقانہ رہا اور ایک سچے عاشق کی طرح انہوں نے عمر بھر اس پیمانِ وفا کو نبا ہا۔

حسرت ساداتِ موہان کے ایک ذی احترام گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت ۱۲۹۵ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء ہے۔ ابتدائی تعلیم قصبے کے اسکول میں ہوئی۔ ذہانت اور فراست بچپن سے نمایاں تھی۔ مڈل کے امتحان میں صوبے بھر میں ممتاز رہے۔ اس کے بعد فتحپور کے سرکاری ہائی اسکول سے انٹرینس بھی درجہ

اوّل میں پاس کیا۔ فتح پور ہی میں ذوقِ شعر و سخن کا آغاز ہوا۔ اُردو کے ساتھ ہی زبانِ فارسی سے بھی ان کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ چنانچہ ابتدائی کلام میں کچھ فارسی اشعار بھی شامل ہیں۔

انٹرینس کے بعد حسرت علی گڈھ کالج پہنچے، جو اُس وقت مسلمانوں کی جدید تعلیم و تہذیب کا مرکز تھا۔

۱۹۰۳ء میں بی۔اے کیا۔ ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں سیّد سجّاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی بھی شامل تھے۔ ذوقِ شاعری اور جذبۂ آزادی علیگڈھ میں خوب پروان چڑھا۔ تحریک آزادیٔ وطن کے عظیم رہنما بال گنگا دھر تلک مہاراج سے حسرت کو غیر معمولی عقیدت و محبت تھی۔ وہ سیاسی مسلک میں اُن کو اپنا پیشوا سمجھتے تھے۔ ۱۹۰۴ء سے حسرت کا تعلق باضابطہ انڈین نیشنل کانگریس سے ہوگیا۔

ان کی بے باکانہ آزادخیالی اور حریت پسندی اور انگریز دشمنی کالج کی تعلیم کے زمانے میں روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ کئی مرتبہ ان کو کالج سے نکالا گیا، لیکن حسرت کی حق گوئی اور صداقت شعاری کو کسی خوف اور مصلحت سے کیا واسطہ، وہ تمام نتائج سے بے پروا ہوکر مخالف آندھیوں میں آزادیٔ وطن کی شمع روشن کرتے رہے۔

بی۔اے کی تکمیل کے بعد بھی حسرت نے علی گڑھ نہیں چھوڑا۔ کالج سے اُٹھ کر شہر میں آگئے اور ایک معمولی سا مکان کرائے پر لے کر مستقل اقامت اختیار کرلی۔ اُن کا شہرۂ آفاق ماہنامہ "اُردوئے معلّٰے" علی گڑھ سے ہی شائع ہوا جسے سیاست و ادب کی تاریخ میں ایک بے مثال اہمیت ہے۔

سودیشی کی تحریک سے حسرت کو ابتدا ہی سے پُرخلوص دلچسپی تھی۔ علی گڑھ میں انھوں نے ایک سودیشی اسٹور بھی جاری کیا۔ وہ ان اوّلیں ہندوستانیوں میں سے ہیں جنھوں نے کھدّر اور گاڑھا پہننے کا سب سے پہلے عہد کیا اور عمر بھر اس وضع کو شوق و محبت سے قائم رکھا۔

کانگریس سے عملی تعلق کے بعد حسرت کی باغیانہ سرگرمیاں بڑھنے لگیں، یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء میں مصر کے سیاسی مسائل پر ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں اُن کو گرفتار کیا گیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ جیل میں اُن کو چکی پیسنے اور سخت صعوبتوں اور اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اِس مردِ مجاہد کی پیشانی پر کبھی ایک شکن نہ آئی۔ جس صبر و رضا اور ہمت و استقلال کے ساتھ حسرت نے اپنی قید بامشقت کے دن گزارے اُس کی روشنی میں حسرت ایک ولیٔ باخدا کی طرح مظہرِ تقدس نظر آتے ہیں۔ ان کی مشہور سیاسی غزل 'رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے' اسی دور کی تخلیق ہے۔[1]

اب مشقِ سخن اور چکی کی مشقت میں ایک عجیب ربطِ محکم پیدا ہو چکا تھا۔[2] ان کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ یا تو انگریزی حکومت کے خلاف فکر و تدبیر میں گذرتا تھا یا نماز روزے کی ادائیگی میں اور جو وقت ان مشاغل سے بچتا تھا وہ فکرِ سخن میں۔ ۱۹۱۶ء میں پھر ایک بار حسرت کو گوشۂ زنداں آباد کرنا پڑا۔ یہ قید بھی

---

[1] اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے — حبِ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم — جبر بزیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے
ہے تو کچھ اُکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ — اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے

(لطیف اعظمی)

[2] حسرت کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے :

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

(لطیف اعظمی)

بامشقت تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں ان کو مختلف دفعاتِ جرم کی پاداش میں سب ملاکر بیس ۲ سال کی سزا دی گئی، لیکن ملک کے بدلے ہوئے حالات کے زیراثر ۱۹۲۴ء میں ان کو رہا کر دیا گیا۔

دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کی زندگی ایک عجیب حسن کے ساتھ مجموعۂ اضداد رہی ہے۔ یہ حُسنِ زندگی حسرت کو بھی بدرجۂ وافر ملا۔ وہ ایک طرف انتہائی لطیف الخیال اور جادو بیان شاعر تھے، جس کی شاعری احساسِ حُسن اور عرفانِ جمال کا معراجِ کمال ہے۔ دوسری طرف حرّیتِ فکر اور آزادیٔ وطن کے۔ ایک ایسے بہادر سپاہی جس کا ایک ایک لمحہ انگریزی حکومت کے نقشِ اقتدار کو مٹانے کی جدوجہد میں صرف ہوتا تھا۔ ایک طرف اُن کی قدامت پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لباس عہدِ طفلی سے رہا، اس میں عمر کے آخری لمحے تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی، وہی سادہ سی شیروانی، وہی شرعی پاجامہ، وہی سُرخ ترکی ٹوپی، جس کا پھُندنا نہ معلوم کب رُخصت ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے اس ٹوپی کو ایک تہائی صدی تک ان کے سر پہ دیکھا۔ روشن خیال اس درجے کے کہ راسخ العقیدہ مذہبی انسان ہونے کے ساتھ وہ اشتراکی نظام کی اقتصادی اور معاشی خوبیوں کے معترف تھے، حج و زیارت کا ذوق و شوق فزوں ہوا تو مسلسل گیارہ بارہ برس تک یہ شرف حاصل کرتے رہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر سال تنہائی خاموشی بلکہ رُوپوشی کے ساتھ سری کرشن کی محبّت کا چراغ لے کر متھرا، برندابن، آگودھری اور برج بھومی کی حاضری دیتے۔ حضرت پیرانِ پیر شاہ جیلانی رح کی محبت میں منقبت کے اشعار کہے، کرشن جی کے حضور میں ہدیۂ محبّت اشعار میں پیش کرتے رہے۔ ان کی ایک مشہور غزل ہے:

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا　　　دم بھرتی ہے آرزو اسی کا

یہی نہیں کہ کرشن جی کی محبّت میں انھوں نے ہندی زبان میں ٹھمریاں بھی لکھیں جو اُن کے کلیات میں شامل ہیں۔

جہاں تک تہذیبِ رسمِ عاشقی کی بات ہے، حسرت اس محفل میں مجدّد کی

[redacted]

حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی بیتابیِ شوق، اُن کا جنونِ پابوسی، ان کی چشمِ اشتیاق، غرض یکساں کا ایک ایک انداز اس قدر شائستہ، مہذب اور پاکیزہ ہے کہ خود عشق مظہرِ حسن بن جاتا ہے:

دیکھنا بھی تو انھیں دُور سے دیکھا کرنا   شیوۂ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری   یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم   اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

اس شوخ کا شکوا کیا حسرت یہ تو نے کیا کیا   اِس سے تو لے مردِ خدا بہتر تھا مرجانا ترا

کسی پر مٹ کے رہ جاتا ہے حسرت   ہمیں کیا کام عمرِ جاوداں سے

اب اُن کے چند ایسے اشعار سُنئے جو اُردو غزل کے لئے ایک دولتِ لازوال ہیں:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد   ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم   ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں   مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار   ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا   آج تک تیری جدائی کا یہ کیونکر گذرا

زبان پر حسرت کو جو دسترس حاصل ہے وہ کسی کو مشکل سے ہو سکتی ہے:

دیکھنا بھی تو انھیں دُور سے دیکھا کرنا   شیوۂ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت   اُن سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

محرومؔ وادیٔ غزل میں

جناب تلوک چند محرومؔ ہماری زبان کے برگزیدہ شعرا میں گنے جاتے ہیں اُن کی علمی اور ادبی خدمات نے تقریباً نصف صدی کے دائرے کو اپنی شعری تخلیقات سے مکمل کیا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک دور افتادہ علاقے میں[۱] پیدا ہوئے، جہاں نہ کوئی ادبی ماحول تھا، نہ شعر و سخن کی محفل آرائیاں، لیکن ان کے ذوقِ خداداد اور طبعِ سلیم نے ایک جادو سا دکھایا، اپنی شاعری اور زبان دانی کی داد اُن کو شیخ عبدالقادر اور مولوی عبدالحق جیسے بزرگوں سے ملی۔ زبان و محاورہ کی صحت و صفائی اور اندازِ بیان کی شستگی و شائستگی میں ان کا جو درجہ ہے، اس کا اعتراف اہلِ زبان بھی احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔

محرومؔ صاحب نے ہر صنفِ سخن میں بہت کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا خوب کہا۔ نظم ہو یا غزل، رباعی ہو یا مثنوی غرض تمام اصناف میں ان کی حُسن پسند اور حُسن آفریں طبیعت نے نگار خانے سجا دیئے ہیں۔ ان کی زندگی شرافت کردار اور فضائلِ اخلاق کی راہوں سے گذری ہے، جذبات کی فراوانی میں بھی ایک لطیف سنجیدگی اور پاکیزہ متانت کا دامن ان سے جُدا نہیں ہوتا۔ غزل کے رشتے میں انھوں نے اخلاقی قدروں کے آبدار موتی بڑے حسن اور سلیقے سے پروئے ہیں۔ جذبے کی صداقت اور ادائے بیان کی سادگی نے ان کے تغزل کو کہیں کہیں غزلِ سعدیؔ کی حد سے قریب کر دیا ہے۔

ابتدائی دَور یا یوں کہیئے کہ عہدِ شباب کی غزلوں میں رنگینی و سرمستی کا پرتو کچھ زیادہ جھلکتا ہے، لیکن وسطی اور آخری دَور کے کلام میں ایک سُبک خرام متانت، ایک خوشگوار تامل اور دلآویز اخلاقی رکھ رکھاؤ کا عالم نمایاں نظر آتا ہے۔

---

[۱] دریائے سندھ کے کنارے ضلع میانوالی کے ایک گاؤں کاجران میں یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے اور ۶ر جنوری ۱۹۶۶ء کو دہلی میں وفات پائی۔ (لطیف اعظمی)

محروم صاحب نے اپنی رُودادِ محبت کو بڑی ریاضت اور محنت سے چھپانا چاہا ہے، لیکن عشق اور مشک کو کون چھپا سکا ہے، اخلاق و فضائل کی بستی میں کبھی کبھی اُن کے لب پر نعرۂ محبت آہی جاتا ہے:۔

نوجوانی میں ترے رُخ پہ، یہ زردی محروم ہو نہ ہو، عشق کا آزار نظر آتا ہے

گیا دورِ عشق و جوانی ہمارا مگر داغِ حسرت ابھی دل نشیں ہے

جوانی کہ "عہدِ گل" کی سر شور و سرشار رنگینیوں سے عبارت ہے، ان کے لئے بہت جلد حدیقۂ اخلاق بن گئی۔ پھر بھی وہ حادثہ جسے آغازِ محبت کہتے ہیں انہیں والہانہ طور پر یاد آتا رہا ہے۔ ایک مسلسل غزل کے چند اشعار سُنیئے:

نگاہِ اوّلیں کی داستانی یاد آتی ہے کسی نامہرباں کی مہربانی یاد آتی ہے
قریبِ شاخِ گل ہوتی ہے جب بستاں سرا بلبل ہمیں بھی بھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے
جوانی اور بوئے گل میں یارب کیا تعلق تھا کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

اِن اشعار میں نظیری کے نظریۂ عشق کا سا انداز ہے، وہی رنگینی اور وہی خود فراموشی۔

محروم کا مسلکِ حیات محبت ہے اور ان کی طریقت خلقِ خدا کی خدمت، ان کی حق پرستی کسی حلقۂ خیال میں محدود نہیں، وہ اپنے دل کو کعبہ سمجھ کر بھی خوش ہوتے ہیں اور بُت خانہ بنا کر بھی، انھیں ناقوس و اذاں میں عجیب ایک رنگی محسوس ہوتی ہے:

مجھے کیا ہے جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں
بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ، گاہ بُت خانہ

کفر و دیں میں اتحاد و جاوداں پیدا کریں نالۂ ناقوس سے بانگِ اذاں پیدا کریں

وہ لباسِ مجاز میں بھی حُسنِ حقیقت کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ اس حق شناسی کا

کے اشارے ان کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں:

ساقی ترا عکسِ رُخ ہے، ورنہ   صہبا رنگیں، نہ جام رنگیں

محسن یہ سارا اسی کا ہے کہ جس کے عشق میں   چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر

کس ستارے میں تجلّیٔ سرِ طور نہیں   جلوۂ حسنِ ازل آج بھی مستور نہیں

سادہ سے سادہ خیال میں بھی محروم اپنی نُدرتِ فکر اور حُسنِ بیان سے ایک نیا رنگ بھر دیتے ہیں:

مایۂ نازشِ دوراں، یہ پریشانی ہے   روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

آخری منزل میں اک سنگیں حقیقت بن گئی   زندگی جس کو سمجھتے آئے تھے، افسانہ ہم

یوں زندگی سے مل کے جوانی، جدا ہوئی   جیسے کوئی کسی سے سرِ رہگذر ملے

(جامعہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء)

روشؔ مرحوم کے چند خطوط

حمیدہ سلطان صاحبہ کے نام

۷۸۶

۲۲۲-اے، پنڈارہ روڈ،
نئی دہلی

۱۶ر جون ۱۹۶۱ء

نگہدارِ اخلاص! سلام مسنون

مکتوب ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کا سفر راحت انگیز رہا اور قیام بھی مسرت بخش اور غیر معمولی طور پر خوشگوار محسوس ہو رہا ہے۔

ارضِ مالوہ کی راتیں ہمیشہ سے خنک اور دل افروز ہوتی ہی ہیں۔ بارانِ رحمت کی آمد نے موسم کو اور بھی سرور ونشاط سے بھر دیا ہے۔

یہاں تو موسم کی شدت ابھی تک عروج پر ہے۔ کل آندھی تو کچھ اس زور کی آئی تھی جیسے خوب ٹوٹ کر پانی پڑے گا لیکن بس آندھی ہی کا زور رہا۔ دو چار چھینٹے بوندوں کے پڑے اور اس کے بعد وہی دہکتا ہوا موسم۔ میری طبیعت دو تین دن ناساز رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ٹھیک ہوں۔ بیگم اور بچے بھی بفضلہ صحت و عافیت سے ہیں۔

مجوزہ مشاعرے کے لئے موجودہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ ذرا بارش

آئے موسم اعتدال پر آجائے تو اس وقت انعقاد زیادہ مناسب ہوگا۔

حالات اور مصروفیتیں اجازت دیں تو یہ اچھا ہوگا کہ آپ کا قیام کچھ اور بڑھ جائے۔ آپ کی شگفتگی اور شادمانی، دماغی سکون اور ذہنی راحت قدرت کا ایک تحفہ ہیں۔ اِس سرمایۂ سکون و اطمینان کے ساتھ جو لمحات گزر جائیں قابلِ احترام ہیں۔

حیدرآباد کے فارسی مصرعِ طرح پر کچھ شعر فیضِ رُوح القدس سے موزوں ہوگئے، لُطفِ خاطرِ عاطر کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مطلع ملاحظہ ہو، جو مصرعِ طرح پر تضمین بھی ہے۔

تا قیامت آبروئے مشربِ رندانہ باش
اول از میخانہ بودی آخر از میخانہ باش

یا شوی ضبطِ مجسم یا سراپا اضطراب
در حریمِ عاشقی یا شمع یا پروانہ باش

بر ملا رفت و روائے کفر و ایماں راکشت
بے تعلق در میانِ کعبہ و بتخانہ باش

لے نیاز انہ متاعِ مہر و اُلفت صرف کن
بہر ہمہ راحت رساں و از ہمہ بیگانہ باش

سانچی کے مشاہدات و تاثرات ضرور لکھئے۔

پیتے نہ زہرِ طنز و ملامت جو ہم روش
پھر بھی تو وضعِ اہلِ محبت سے دُور تھا

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم،

اپنی میزبان بیگم کی خدمت میں سلام و نیاز پیش کیجئے۔

ر۔ صدیقی

۲۹ر جون

نازشِ اخلاص۔ آداب

مکتوب روبرو ہے اور خیال کی محفل تصورات سے آباد۔ سادگی و پرکاری

کے دلآویز امتزاج کا اعتراف کب نہیں تھا، لیکن یہ خط تو وادیٔ اعتراف سے بھی کچھ دُور لے گیا۔ ع

وہ میرے حُسنِ تصور سے بھی بلند رہے

☆

خدا کا شکر ہے، موسم یہاں بھی خوشگوار ہو چلا، شنبہ اور یکشنبہ کی درمیانی شب میں بارانِ رحمت کا آغاز ہوا، خوب پانی پڑا، اس کے بعد بھی کچھ بوندا باندی ہوئی اور اس وقت کہ یہ خط لکھ رہا ہوں، گھٹائیں خوب گھر کر آتی ہیں، ہوا میں ایک خنکی اور شادابی، شاید کہیں بارش ہو چکی یا ہو رہی ہے، دفتر سے گھر جاتے ہوئے آج بھیگنا پڑے گا۔ موسم کا تقاضا دیکھئے یہ چھینٹے بھی کیا مزا دیتے ہیں۔ بھیگنے کے خیال سے بھی جی خوش ہو رہا ہے۔

○

حبیب صاحب کی ادبی نشست خوب رہی ہوگی۔ سب سے زیادہ غزلیں خود انھوں نے سُنائی ہوں گی، بڑی فن کارانہ سادگی سے شعر سُناتے ہیں۔ آدمی بڑے شائستہ اور معقول ہیں، ہمارانی سے آپ کی ملاقات ہو گئی، اچھا ہوا۔ اُن کے اندازِ طبیعت میں کچھ آپ کا سا رنگ بھی ملتا ہے، مگر وہ بات کہاں!

○

ایک خوبصورت جھیل کے سینے پر تیرتی ہوئی نازک سی کشتی میں بیٹھ کر انسان جہاں بھی پہنچ جائے، برحق —— لیکن ہوا یہ ہوگا کہ کشتی گھوم پھر کر کنارے پر واپس آ گئی ہوگی، بہرکیف مسرت کے یہ چند لمحے بھی بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

○

جی ہاں، آج میں خود بھی، راج گھاٹ، بنڈارا روڈ اور پارلیمنٹ اسٹریٹ کی مثلث پر غور کرتا رہا۔ یہ زاویے کوئی بھی رُخ اختیار کریں میں اپنی گوشہ نشینی سے مطمئن ہوں —— منزل بھی تو ایک سمت کی طرف اشارا کرتی ہے۔ لیجئے

مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کا مسئلہ حل ہوا۔

○

پہنچ سکتا تو کیسی خوشی ہوتی۔ خیر یہ خوشی بھی کیا کم ہے کہ اس حسنِ خلوص سے یاد کیا گیا۔ ۵ رکو ان شاء اللہ حضرتِ غالبؔ کی بات پھر دُہرائی جائے گی، وہی دیدہ و دل فرشِ راہ۔

○

دلّی کی بے شمار مصروفیتوں سے دُور یہ دو ہفتے سکون و فرصت کے ساتھ آپ نے گذارے۔ اس کی بڑی خوشی ہے۔ اُمید ہے کہ، بفضلہٖ نئے ارادوں اور نئے کاموں کے لئے آپ ایک لطیف تازگی اور شگفتہ توانائی ساتھ لائیں گی۔

ع۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

○

میں ۲ رکو میرٹھ جاؤں گا اور ۳ رکو باجی قبلہ مدظلہٗ بیگم اور بچوں کے ساتھ بفضلِ تعالےٰ دلّی واپسی۔

والسلام

" د "

مولانا نعمت اللہ خاں صاحب کے نام

محترم مکتوب الیہ مہوبا ضلع باندا (یو۔پی) کے رہنے والے ہیں مرحوم اثرؔ اور ان کی شاعری کے بارے میں موصوف کا ایک طویل مضمون اس وقت موصول ہوا جب اس نمبر کی کتابت مکمل ہو گئی تھی، اس لئے اس میں شریک نہیں کیا جا سکا۔ البتہ مرحوم کا ایک مختصر سا خط جو اس مضمون میں شامل تھا، ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۳۳۳۔ مشائخان، میرٹھ

۱۳؍ اکتوبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم و آلہٖ و اصحابہٖ و اجمعین

محترم اسرار اخلاص مودت ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

پچھلے دنوں آپ بے اختیار یاد آتے رہے۔ آپ کا اخلاص نامہ وادی خیال کے انہیں خوابوں کی تعبیر ہے۔ ماشاء اللہ والحمد للہ

مہوبا آنے کے لئے مجھے بھی مشتاق تصور فرمائیے۔ ہم خیالی اور ہم مشربی کا یہ حُسن جو حرف حرف سے جھلکتا ہے، میرے لئے دولتِ بے بہا سے کم نہیں سلامت باکرامت رہیں آپ۔ ع

مجلس یارانِ یک دل کیمیائے دیگر است

مرزا غالب کے منشی نبی بخش حقیر تو یاد ہوں گے۔ مرزا کو ان کی شعر فہمی پر کیا کیا ناز تھے۔ آپ کا عرفان ادب اور ذوقِ جمالِ شعر تو ایک نعمتِ ربانی ہے۔ ماشاء اللہ

والسلام

آپ کا روشؔ صدیقی

جناب شبنم سبحانی صاحب کے نام

حضرت روشؔ مرحوم کے بارے میں جناب شبنم سبحانی صاحب کا ماہنامہ "دوام" (فیض آباد) بابت ماہ اپریل ۱۹۷۱ء میں ایک تاثراتی مضمون شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے مرحوم کے تین خط نقل کئے ہیں، جنہیں ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مرادآباد

۱۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء

جادہ پیمائے اخلاص ومحبّت، السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

الحمدللہ آپ کے تازہ مشاہدات وتاثرات نے ان حجابات کو اُٹھا دیا جو اشتراکیت کی خود فروشانہ پستیوں کو چھپائے رہتے ہیں۔ لکھنؤ میں جو کچھ آپ نے دیکھا ہے وہ تو سمندر میں ایک قطرہ کے برابر ہے.... نیکی کی تعریف میں قرآن حکیم نے امر معروف ارشاد فرمایا ہے۔ اس امر معروف کے لئے ذوقِ سلیم خود ایک کشش اور جذبۂ وابستگی محسوس کرتا ہے۔ عزیز بھائی! اب وقت آگیا ہے کہ خود زندگی حسن وعمل کے اعتبار سے امر معروف بن جائے۔ اب منکرات کا طلسم توڑنے کے لئے حسن وعمل کا جہاد ہی کامراں ہوسکتا ہے۔ اس حسن عمل اور حسنِ خیال کے امتزاج سے زندگی سنور سکے گی۔

(۲)

مرادآباد

۱۶ر نومبر ۱۹۵۷ء

خضرِ منزل سے کم نہیں شاید ایک ہمدرد اجنبی کا خلوص

جادہ پیمائے محبت فی اللہ زاد اللہ خلوصکم، السلام علیکم

آپ کا مکتوب وقت پر ملا —— جیسے مجھے اس کا انتظار سا تھا۔ امام الادب حضرت سہیل کی غمناک رحلت کا اثر دیر تک شریکِ حال رہے گا۔ نصف صدی کی روایتِ علم وادب ایک باوقار شمع کی طرح ان کے نہاں خانۂ دل میں روشن تھیں۔ اب جبکہ وہ خود شریکِ محفل نہیں ہیں، یہ روشنی دور تک پھیلے اور بڑھے گی (انشاءاللہ الرحمٰن) کارواں کے متعلق —— اور ضمن میں اس دعاگزار کے بارے میں آپ نے جن افکار وخیالات کا اظہار کیا ہے، وہ آپ کی پاکیزگیِ طبع کے آئینہ دار سہی لیکن مجھے محجوب بنانے کے لئے کم نہیں۔ پھر بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ جانے آپ کب سے شریکِ کارواں ہیں۔

آپ حضرات ممکن ہے اِس خاک نشین سے دُور رہے ہوں لیکن یاد فرمائیے، یہ گدائے کوئے اخلاص کبھی دور نہ رہا۔ آپ لوگ دین و ملّت کی متاعِ عزیز ہیں۔ ایک خادِمت گزار دُور رہے تو کیونکر۔ یوں بھی قُرب و بعد کا معاملہ احوالِ ظاہری سے کچھ زیادہ تعلق نہیں۔

خلوصِ عزم کی وہ چنگاری جو آپ کے پاکیزہ دل میں روشن ہے بڑی دین ہے خدا کی۔ اس چنگاری کی زندگی اور بقا جس سوز دروں کی مقتضی ہے، جانتا ہوں کہ آپ اس سوز دروں سے بے خبر نہیں ہیں۔ کتنا اہم، عظیم اور مہتم بالشان ہے، وہ مقصد جو آپ کے سفرِ حیات کا مقصود ہے۔ ہادیٔ برحق حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) آل و اصحاب پاک حضورؐ اور اولیائے امتؒ کا فیضانِ رحمت رہنمائی فرمائے۔

کارواں پر اپنے وجدان و یقین کی روشنی میں ایک مفصّل تنقیدی مقالہ لکھئے۔ اب تاخیر کا وقت نہیں، بڑا وقت رائگاں ہوچکا ہے۔

(۳)

پیارے شبنم بھائی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حبیبِ ازلی حکیم فضل الرحمٰن فریدی کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع سے دل ودماغ پر جو عالم گزر گیا ناقابلِ بیان ہے۔ ایک تہائی سے زیادہ مدّت کی یہ داستان خلوص و مودت اس طرح ختم ہوجائے گی، خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ مرحوم کی خاموش، پُرخلوص دینداری، نکھری ہوئی مشرقی تہذیب اور باوقار وضعداری نے ان کی شخصیت کو ایک دلآویز مرقع بنا دیا تھا۔ اس مرقع میں اخلاص و وفا کا رنگ بہت گہرا تھا۔ خدمتِ خلق اور دردِ انسانیت ان کا مسلکِ زندگی بن چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک شائستہ انسان کے لباس میں وہ ایک درویش باخدا کی طرح زندگی کا سفر طے کرتے رہے۔ ان کی وفات ایک نوع کی شہادت ہے رحمٰن ورحیم بہ طفیلِ حضورؐ قربِ رحمت ومغفرت ان کی روحِ پاک کو نصیب فرمائیے۔

آمین - غریبوں کے وہ معصوم بچے جن کو وہ اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے بے اختیار یاد آرہے ہیں - ایک شفیق اور محبت سرشت محسن کا ان سے جدا ہو جانا بہت بڑا صدمہ ہے - خدا ان سب کو سکون و تسلّی عطا فرمائے -

جناب شاہد سعید صدیقی صاحب کے نام

ذیل میں مرحوم کا وہ خط شائع کیا جاتا ہے جسے انہوں نے انتقال سے صرف ایک روز پہلے اپنے صاحبزادے کے نام لکھا تھا جو اُس وقت ایم ایس سی (فائنل) کے امتحان کی تیاری میں مشغول تھے -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

والہٖ واھل بیتہٖ واولیاءِ اھلبیتہٖ وَاَجْمَعِیْن

میرٹھ

۲۲ر جنوری ۱۹۷۱ء

پیارے پاشو بیٹے سلمہ اللہ الرحمٰن

ہزاروں دعائیں - ارحم الراحمین تم کو حفظ و سلامتی کے ساتھ تمام آفات و حادثات سے محفوظ و مامون رکھے - آمین !

تمہارا پیارا خط میں نے کئی مرتبہ پڑھا - بفضلہٖ تمہاری ہمّت اور محنت سے دل خوش ہوتا ہے - ارحم الراحمین کے فضلِ بے اندازہ پر نظر رکھو - بطفیل حضورؐ رحمۃ للعالمین سب مراحل بسلامتی و حسن و خوبی طے ہو جائیں گے -

O

میں آج شاہجہانپور مشاعرے میں جا رہا ہوں - کل انشاءاللہ میرٹھ واپسی اور ۲۴ر کو دہلی مشاعرہ جشنِ جمہوریت میں شرکت کروں گا - انشاءاللہ - ۲۸ر کو

جموں کے مشاعرے میں شرکت کروں گا۔

خدا کا شکر ہے کہ تمہاری امی جان مدظلہا کی صحت بہتر ہے اور بشریٰ سلمہا اسلم میاں سلمہٗ حسن میاں سلمہٗ اور ہما بی بی سلمہا بہت انہماک کے ساتھ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہیں۔

ہاں بیچاری تسلیمہ کی والدہ بشیرن کا انتقال ۲۰ جنوری کو ہو گیا۔ خدا مغفرت فرمائے۔ بہت نیک اور صلح جو بی بی تھیں۔

تم بھی ظہور احمد کو ایک خط تعزیت کا لکھ دینا۔

ہاں اس مرتبہ کانووکیشن کب ہے۔ مشاعرہ ہوا تو اس بہانے تم کو دیکھ لوں گا۔

والدعا

باباجان

(حاشیہ پر)

ہر سانس تمہاری زندگی سلامتی اور تندرستی اور عافیت اور راحت کے لئے دُعا گزار ہے۔ عزیز گرامی محمد الیاس سلمہٗ اور سب احباب سے سلام و دعا کہنا۔

والدعا

باباجان

بزمِ ثاقب کا ایک خصوصی مشاعرہ

منعقدہ ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء جس کی صدارت حضرت روش صدیقی نے فرمائی





مہاتما گاندھی

مسافرِ ابدی کی نہیں کوئی منزل
یہاں قیام کیا یا وہاں قیام کیا

تری وفا نے بڑے مرحلے کئے آساں
فروغِ صبح کو تُو نے فروغِ کام کیا

صنم کدوں میں بڑھا اعتبارِ اہلِ حرم
حرم نے دَیر نشینوں کا احترام کیا

حیات کیا ہے محبّت کی آگ میں جلنا
یہ راز بھی ترے سوزِ وفا نے عام کیا

اُٹھا اُٹھا کے حجاباتِ چہرۂ منزل
مسافرانِ صداقت کو تیز گام کیا

گذر کے دانشِ حاضر کے آسمانوں سے
بلند سادگیٔ عشق کا مقام کیا

ملا جو دستِ حوادث سے زہر بھی تجھ کو
بڑے خلوص سے تُو نے شریکِ جام کیا

وہ درد تیری خموشی میں تھا نہاں جس نے
سکوتِ ناز کو آمادۂ کلام کیا

صِلہ تھا تیری ریاضت کا صبحِ آزادی
وہ صبح جس کو غلاموں نے ننگِ شام کیا

ابھی تو گوش بر آواز تھی بھری محفل
کہاں یہ تُو نے کہانی کا اختتام کیا

خیالِ دوست کا پرتَو تھی کائنات تری
اِسی تلاش میں گم ہو گئی حیات تری

طلسمِ غیر تجھے کیا اسیر کر سکتا — نہ چھو سکی کوئی زنجیرِ ماسوا تجھ کو
کسی کے وہم و گماں میں بھی یہ مقام تھا — پیامِ دوست بہت دور لے گیا تجھ کو
جلالِ خدمتِ خلقِ خدا ہوا ظاہر — ترے خدا نے بڑا مرتبہ دیا تجھ کو
یہاں تو ہے ترے قاتل سے موت بھی بیزار — وہاں نصیب ہوئی منزلِ بقا تجھ کو
وہ قوم جس کو دیا حُسنِ زندگی تُو نے — خود اُس کے خوابِ پریشاں نے کھو دیا تجھ کو
یہ موت بھی جو بظاہر ہے بحرِ لامحدود — نہ کر سکے گی دلِ ہند سے جُدا تجھ کو
ہے ذرّہ ذرّہ تری خاک کا عزیزِ وطن[۳] — بُھلا سکے گی کہاں ارضِ ایشیا تجھ کو
بُلا کے بارگہِ بختیار کاکی میں — کِسے خبر کہ مشیت نے کیا دیا تجھ کو

تری ضیا سے ہے روشن دلِ وطن اب بھی
اس انجمن میں ہے تو شمعِ انجمن اب بھی

۱۶ جون ۱۹۴۸ء — ہفتہ وار "نئی روشنی" دہلی

---

[۱] ایک اور جگہ یہ نظم چھپی ہے جس میں یہ شعر نہیں ہے، اس کے بجائے حسب ذیل دو شعروں کا اضافہ ہے،

یہ سوچ کر کہ محبت ہے روح کا آرام — سکونِ کوئے بے تابیٔ دوام کیا
سمجھ لیا کہ ملامت ہے آبروئے وفا — نہ بھول کر کبھی سودائے ننگ و نام کیا

[۲] ایک اور رسالے میں یہ مصرع اس طرح چھپا ہے: تلاشِ حق سے فروزاں تھی کائنات تری
[۳] ایک اور جگہ یہ مصرع یوں ہے: تمام عمر تجھے ایشیا سے پیار رہا
نیز حسب ذیل دو شعر زیادہ ہیں:

جو نا سپاس تری زندگی کے دشمن تھے — کریں گے یاد وہی مرگ آشنا تجھ کو
ہوئی ہے غرق تری کشتیٔ حیات جہاں — خیال نے وہیں دیکھا ہے ناخدا تجھ کو

پنڈت جواہر لال نہرو

روشنی رخت کشِ گوشۂ آرام ہوئی
دن ابھی ڈھل نہ سکا تھا کہ یہاں شام ہوئی
پردۂ ابر میں خورشیدِ جہاں تاب چھُپا
ایک ظُلمت تھی کہ مہمانِ در و بام ہوئی
کچھ قیامت کے سے آثار نمودار ہوئے
ناگہاں رحلتِ نہرو کی خبر عام ہوئی
اُڑ گئے ہوش ہجومِ غمِ تنہائی سے
وحشتِ اندوہ میں گُم گردشِ ایام ہوئی
قافلہ ذہن کا ٹھہرا ہے اسی لمحے پر
یوں تو کہنے کے لئے صبح ہوئی شام ہوئی
ہند کی دولتِ بیدار کو کیوں لُوٹ لیا
موت نے مشرق و مغرب کا سکوں لُوٹ لیا

دل شکستہ غمِ دَوراں ہے کہ غم خوار گیا
غمِ دل مائلِ فریاد کہ دل دار گیا
زرد و افسردہ و حیراں ہے رُخِ امن و سکوں
امنِ عالم کا طلب گار و نگہدار گیا
دیکھیئے حسرتِ تعمیر پہ کیا گزرے گی
ساتھ ہی اُس کے فروغِ در و دیوار گیا
اُٹھ گیا خدمتِ مخلوق تھا جس کا مذہب
جس کے ہر رنگ میں تھا جلوۂ ایثار گیا
وہ خوش آداب و تہذیبِ بشر کا نقّاش
صاحبِ محفلِ رعنائیٔ افکار گیا
مادرِ ہند کی ہر سانس ہے اِک نشترِ غم
مادرِ ہند کا فرزندِ جگر دار گیا
چل بسا نعرۂ آزادیٔ انساں کا نقیب
صبحِ بیداریٔ مشرق کا علَم دار گیا
دجلہ و نیل کی موجیں ہیں فغاں آمادہ
وادیٔ گنگ و جمن کا گُلِ بے خار گیا

چہرۂ منزلِ مقصود ہے رُو پوشِ غبار
قافلہ راہ میں ہے، قافلہ سالار گیا
شدّتِ غم سے تعیّن کی حدیں ٹوٹ گئیں
دُور تک سلسلۂ دیدۂ خُونبار گیا
یک بیک دل میں اک آہنگِ خوش انداز آئی
قالبِ نُور میں ڈھلتی ہوئی آواز آئی
آ گئی نیند مسیحا کو تو مایوس نہ ہو
کہ محبّت کی مسیحا نفسی باقی ہے
دَورِ پیمانہ رُکا ہے تو گِلہ مند نہ ہو
چشمِ ساقی کا سرورِ ابدی باقی ہے
سُست بُنیاد ہے یہ کشمکشِ مرگ و حیات
پرتوِ عشق خفی ہو کہ جلی باقی ہے
مشعلِ نُور ہے مخلوقِ خدا کی خدمت
اسی مشعل سے فروغِ ازلی باقی ہے
نہ رہا تیشۂ فرہاد تو دل تنگ نہ ہو
ہمّتِ بازوئے مزدور ابھی باقی ہے

زُلفِ آشفتۂ گیتی بھی سنور جائے گی
ہم نفس عشق کی آشفتہ سری باقی ہے
کہیں مِٹتا ہے جمالِ رُخِ زیبائے حیات
حُسن باقی ہے اگر خوش نظری باقی ہے
کیوں ہیں درماندۂ حسرت ترے اشکوں کے چراغ
حلقۂ انجمنِ نیم شبی باقی ہے
دل ہو بیدار تو اس شوخ کے پیغام بہت
صبح باقی ہے، نسیمِ سحری باقی ہے
وادیٔ عشق سے جب بادِ صبا آئے گی
دلِ نہرو کے دھڑکنے کی صدا آئے گی

مولانا ابوالکلام آزاد

خاموشی، تمکنتِ کوہِ گراں کی صورت
گفتگو، زمزمۂ جوئے رواں کی صورت

خلوتِ حُسنِ یقیں تھی تری محفل کہ جہاں
نظر آتی ہی نہ تھی وہم وگماں کی صورت

تیرے ایثار نے پھونکا ہے کچھ ایسا افسوں
زندگی بھول گئی سُود و زیاں کی صورت

اِک نفس، معتکفِ منزلِ آرام و سکوں
اِک نفس، قافلۂ دردِ نہاں کی صورت

اِک نفس، شعلۂ افروزِ حریمِ دانش
اِک نفس، شمعِ خراباتِ فغاں کی صورت

تُو نے اِس طرح اُٹھایا رُخِ دوراں کا نقاب
بول اُٹھی مُنھ سے بہار اور خزاں کی صورت

اِک نظر تشنگیِ صبحِ ازل کی تصویر
اِک نظر سلسلۂ رطلِ گراں کی صورت
اِک نظر شورش و طوفانِ بغاوت کا پیام
اِک نظر ناقدِ آئینِ جہاں کی صورت
پختگی، مدرسۂ حکمتِ خاراشکنی
نرمی، کارگہِ شیشہ گراں کی صورت
سادگی، چشمِ غزالیں کے لئے آئینہ
برہمی، شعلۂ رُخسارِ بتاں کی صورت
وہ صداقت کا جلال اور محبت کا جمال
چادرِ ابر میں خورشیدِ رواں کی صورت
ہمہ اسرارِ دل آرائی و دل باختگی
تجھ سے مانوس دلِ ہم نفساں کی صورت
تیرے افکار کا آئینہ، وہ کردار ترا
لالہ و گُل کے لئے جُوئے رواں کی صورت
جیسے اِک معجزۂ جنبشِ لب یاد آئے
وہ دل آویز، ترے حُسنِ بیاں کی صورت

خود بخود لوحِ تخیّل پہ اُبھر آتی ہے
ساقیِ محفلِ صاحب نظراں کی صورت
دَور میں جب مہ و خورشید کا جام آتا ہے
اہلِ محفل کی زباں پر ترا نام آتا ہے

(۲۲ر فروری ۱۹۶۲ء)

غالب

(شخصیت اور فن کا ایک تجزیہ)

سُبک خرام ہے یہ محملِ وجود و عدم
رواں دواں ہیں نقوشِ جہانِ لوح و قلم
ہے ارتقائے مسلسل حکایتِ آدم
جہاں سے شورشِ میخانۂ حیات چلی
وہیں سے غالبِ آشفتہ سر کی بات چلی

○

غبارِ دامنِ ماضی و حال تھا ہر چند
خرابِ کیفِ نشاط و ملال تھا ہر چند
اسیرِ حلقۂ دامِ خیال تھا ہر چند
وہ خوش نظر تھا جہاں بھی رہا بلند رہا
فلک کو شکوۂ کوتاہیِ کمند رہا

○

بسائے نرگسِ جادو میں اُس نے خواب کچھ اور
بڑھائے گیسوئے اُردو میں پیچ و تاب کچھ اور
اُٹھا اُٹھا کے گرائے بھی ہیں حجاب کچھ اور
یہ فیض ہے اسی صورت شناسِ معنیٰ کا
غزل کو حسن ملا ہے غزالِ رعنا کا

○

سکوت دشتِ تحیّر کے صبح و شام کہیں
نشید قافلۂ فکر تیز گام کہیں
فروغِ جام، بنامِ شکستِ جام کہیں
شعور گم شدگی رسم و راہ سے آگے
غرورِ خود نگری مہر و ماہ سے آگے

○

فسونِ نرگسِ مستانہ بیخودی اُس کی
کمال شیوۂ رندانہ بیخودی اُس کی
سلیقۂ دلِ دیوانہ بیخودی اُس کی
گریز ہوش ہی تنہا رفیق تھا اُس کا
سنبھل سنبھل کے بہکنا طریق تھا اُس کا

○

سکونِ دردِ مسیحا کا وقت آیا ہے
طلوعِ خوابِ زلیخا کا وقت آیا ہے
جوابِ وعدۂ فردا کا وقت آیا ہے
رُکا ہے وادیٔ دانش میں قافلہ غم کا
یہی تو وقت ہے حُسنِ خلوصِ آدم کا

○

یہ دشتِ علم ، یہ وہم و قیاس کی دیوار
فروغِ چہرۂ اقرار ، غازۂ انکار
یہ شعلۂ غمِ دل ، یہ ردائے لیل و نہار
چلو کہ کشفِ حجاباتِ کائنات کریں
روش سے غالبِ راز آشنا کی بات کریں

بہادر شاہ ظفر
کی یاد میں

صبا یہ رُوحِ ظفر کا پیام لائی ہے
کہ سلطنت سے فزوں عشق کی گدائی ہے
غرورِ فتح کو بھی لڑکھڑا دیا جس نے
ترے خلوص نے ایسی شکست کھائی ہے
کسے خبر ہے کہ ارضِ وطن پہ کیا گزری
کہ تجھ کو گوشۂ غربت میں موت آئی ہے
مرے چمن میں عروسِ بہارِ آزادی
ترے مزار پہ آنسو بہا کے آئی ہے

سیّد احمد اللہ شہیدؒ

(فیض آبادی)

(انقلاب ۱۸۵۷ء کے شہیدوں میں گلِ سرِ سبد)

غمِ مصلحت سے گذرا تو سمجھ سکا زمانہ
کہ وطن کی آبرو تھا ترا عزمِ باغیانہ

یہ وہ دردِ حریت تھا جو ملا ازل سے تجھ کو
یہی گریۂ سحر تھا، یہی نالۂ شبانہ

وہ طلسم تُو نے توڑا جو متاعِ سامری تھا
ترے نام سے شکستہ قفسِ فرنگیانہ

تری صبح سرفروشی، تری شام جاں نثاری
ترے اِک نفس میں پنہاں تری عمر کا فسانہ

تجھے کون روک سکتا، تجھے کون ٹوک سکتا
مگر آہ مکرِ شیطاں کو ملا عجب بہانہ

رُخِ دوستی نے کانٹے تری راہ میں بچھائے
کہ یہی فریب و سازش ہے بساطِ بُزدلانہ
غمِ دوست، دلگدازی، غمِ دہر حیلہ سازی
یہ سرورِ عشق و مستی، وہ شعورِ تاجرانہ
وہ حفاظتِ وطن میں ترا جذبۂ شہادت
وہ شکست جس سے لرزاں تب و تابِ فاتحانہ
ترے جسم کو جلا کر، تری خاک کو بہا کر
ہے ہنوز غرقِ خجلت کوئی مجرمِ زمانہ
یہ نویدِ برملا ہے، یہی غیب کی صدا ہے
کہ ترے لہو سے نکھرا رُخِ تازۂ زمانہ
یہ مری نئی سحر ہے تری شام کا عطیہ
تری آہِ نیم شب ہے، یہ مرا نیا ترانہ

شکستِ جام

فروغِ بادۂ خوش جام کی قسم تم کو
تجلّیٔ سحر و شام کی قسم تم کو
رہینِ چشمِ سیہ، نشۂ مدام سہی
تصدّقِ لبِ لعلیں، بس ایک جام سہی
یہ سیلِ نُور، یہ میخانۂ شبِ مہتاب
زہے نشاط! کہ لب آشنا ہو جامِ شراب

○

عطائے چشمِ کرم ہو تو زہر بھی پی لُوں
ملے نہ اِذن تو آبِ بقا سے لب سی لُوں
مگر یہ خوابِ نشاطِ گریز پا کیا ہے
نثارِ خاطرِ نازک یہ ماجرا کیا ہے
یقینِ عشق کو شرمندۂ گماں نہ کرو
خرابِ بادۂ اُلفت کا امتحاں نہ کرو

○

مزاجِ شاہدِ گُل ناتواں رہے کب تک
عروسِ خلوتِ مینا، نہاں رہے کب تک
بنامِ زُلفِ پریشاں، بس ایک دَور سہی
قبولِ نرگسِ مخمُور ہو تو اور سہی
سرورِ بادۂ انجم کا واسطہ پی لو
تمھیں، تمھارے تبسّم کا واسطہ پی لو

○

عجب یہ راز سرورِ مدام سمجھا ہے
نشاطِ عمُر کو مرہونِ جام سمجھا ہے
سرورِ عشق بھی، اور عزمِ میکشی بھی ہے
کہو یہ بات، سزاوارِ عاشقی بھی ہے؟
ہوائے بادۂ جامِ بلور رہنے دو
یہ آگ دامنِ ہستی سے دُور رہنے دو

اِس اجتناب پہ دائم نثار جام و سبو
ہزار بادۂ رنگیں، ہزار جام و سبو
برس رہی تھی جو، مے شوخیٔ تکلّم سے
دو آتشہ ہوئی رعنائیٔ تبسّم سے
گریز کے لئے اب گوشۂ جواز نہیں
نہیں نہیں کی سند، اے نگارِ ناز نہیں

○

شراب ہی نہیں، ذکرِ شراب بھی باطل
مآل جس کا ہوس ہو، وہ خواب بھی باطل
یہ عیش، وجہِ فراوانیٔ ملال بھی ہے
شراب، حسنِ سکوں کے لئے زوال بھی ہے
مقامِ فکر ہے یہ شیوۂ غلط کوشی
نشاطِ زیست ہو محتاجِ خود فراموشی

یہ مے نہیں ہے، مگر مایۂ دلِ مہتاب
یہ مے نہیں ہے، مگر کوثر و بہشت کا خواب
فروغِ لالہ ہے، رعنائیِ گلاب ہے یہ
طلوعِ صبحِ بہاراں کا آفتاب ہے یہ
علاجِ کشمکشِ اضطراب ہونے دو
شریکِ جام، لبوں کی شراب ہونے دو

○

خطا معاف یہ درمانِ اضطراب نہیں
علاجِ آتشِ دل، ساغرِ شراب نہیں
فروغِ لالہ نہ رنگینیٔ گلاب ہے یہ
لباسِ آب میں اک آتشیں عذاب ہے یہ
شرر فشاں یہی خانہ خراب ہے شاید
شراب، داغِ دلِ ماہتاب ہے شاید

سوال لطفِ جہاں ہے، وہاں عتاب ہے کیوں
جوابِ شوقِ فراواں، یہ اجتناب ہے کیوں
نشاطِ کوثر و تسنیم سے حذر کب تک
گریزِ بادۂ رنگیں سے اس قدر، کب تک
یہ عکس ہے گل و ریحاں کے خوابِ رنگیں کا
سراغ جام سے ملتا ہے ماہ و پرویں کا

○

شراب آہ یہ وہ برقِ خرمنِ جاں ہے
کہ جس کے فیض سے شاداب کشتِ عصیاں ہے
ہو خاک کوثر و تسنیم کا سرور اس میں
کہاں سے آئے گا خُلدِ بریں کا نُور اس میں
تجلّیِ مہ و پرویں کہاں، شراب کہاں
شرارِ تاک کہاں، شمعِ ماہتاب کہاں

نہیں ہے خوب یہ تحقیر بادۂ عنبی
چراغِ زندہ دلاں ہے یہ ماہِ نیم شبی
بسی ہیں لالہ و گُل کی جوانیاں اس میں
چھپی ہیں خُلدِ بریں کی کہانیاں اس میں
یہ مے نہیں ہے جو ڈھل کر سبو سے آئی ہے
بہار، مُجلہ گہِ رنگ و بُو سے آئی ہے

○

نہ مہرِ صبحِ زرافشاں، نہ ماہِ نیم شبی
ہے شمعِ راہ زنی، جامِ بادۂ عنبی
ہے سیلِ آتشِ نمرود شعلہ ریز اس میں
اُسی کا خون ہے آمادۂ ستیز اس میں
یہ آبِ زہر ہے صہبائے مُشکبار نہیں
ایاغِ خونِ بہاراں ہے یہ، بہار نہیں

یہ وعظ، حُسنِ تکلّم کا شاہکار سہی
حدیثِ ترک، سزاوارِ اعتبار سہی
مگر سوال تقاضائے حال بھی کچھ ہے
گناہِ دل شکنی کا خیال بھی کچھ ہے
یہ خیر و شر یہ رہِ امتیاز خوب نہیں
شکستِ خاطرِ اہلِ نیاز خوب نہیں

○

بہت عجیب ہے افسانۂ فریبِ خیال
کہ زندگی سے عبارت ہو زندگی کا زوال
قبولِ پاک نگاہاں شراب کیا ہوگی
فراغ بخش یہ خانہ خراب کیا ہوگی
خمیر اِس میں اُبلتا ہے بے وفائی کا
پئیے، وہ اس کو جو بے درد ہو خدائی کا

فریبِ زہد و تقدّس کی داستاں کب تک
یہ سیلِ نور، یہ تاریکیٔ گماں کب تک
فروغِ ماہ کو فرشِ رہِ ایاغ کرو
اِس آفتاب سے روشن دل و دماغ کرو
کوئی بہانہ جو اے ذی شعور تم نے کیا
سمجھ لو شیشۂ دل چُور چُور تم نے کیا

○

اسیرِ جام و سُبو خوش نظر نہیں ہوتے
گُم اِس طلسم میں اہلِ خبر نہیں ہوتے
شراب، شمع بُجھاتی ہے عقلِ انساں کی
متاع لُوٹتی ہے پھر حیا و ایماں کی
شرارِ سینۂ شیطاں کو مُنھ لگائے کون
دل و دماغ کو آتش کدہ بنائے کون

کہاں پہنچ کے مجھے لڑکھڑا دیا تم نے
عجیب خواب تھا جس سے جگا دیا تم نے
لرز رہے ہیں مرے ہاتھ دل دھڑکتا ہے
ہر ایک سانس میں شعلہ کوئی بھڑکتا ہے
مرا ایاغ ہوا غرقِ تیرگی شاید
اُبھر رہی ہے محبت کی روشنی شاید

○

ایاغ، مرگِ مسلسل ہے زندگی کے لئے
ہوائے غم ہے چراغان سرخوشی کے لئے
یہ جامِ زہر ہے دُور اس کو پھینک دو پیارے
اِسے پیو تو ہمارا لہو پیو پیارے
اب اس کے بعد، محبت کو تاب کیا ہوگی
عزیز ہم سے زیادہ شراب کیا ہوگی

حجابِ چشمِ گراں خواب سے اُٹھایا ہے
بصد خلوص مری رُوح کو جگایا ہے
حواس کھو ہی دیئے تھے ہجومِ غفلت نے
رہِ نجات دکھائی ، مگر محبّت نے
ندائے غیب ہو، بیداریٔ ضمیر ہو تم
مجھے سنبھال لیا تم نے دستگیر ہو تم
بس آج سے ہوسِ بادۂ مغاں رخصت
نزولِ نور رہے، اے ظلمتِ گماں رخصت
سپردِ خاک متاعِ غرور کرتا ہوں
یہ جامِ زہر ابھی چور چور کرتا ہوں

حُسنِ گریزاں

مرے سروِ ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا
ستمِ نگاہ رسیدہ کیوں میں نگاہ بھر کے تو دیکھ لوں
تو قرارِ دل ہے ذرا ٹھہر میں ذرا ٹھہر کے تو دیکھ لوں
ترا پیار ہے مری زندگی تجھے پیار کر کے تو دیکھ لوں
ہوسِ نگاہ بھری نہیں
وہ جو تشنگی تھی بجھی نہیں
کوئی دیر بھی تو ہوئی نہیں
یہ سکوں یہ فرصتِ آرزو یہ شبِ دراز ابھی نہ جا
مرے سروِ ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا

ابھی ماہتاب ہے چرخ پر — تجھے ماہتاب نہ دیکھ لے
ہے یہ سوچ لیلیٰ شب کہیں — تجھے بے نقاب نہ دیکھ لے
پسِ پردہ کوئی چھپا ہوا — تجھے بے حجاب نہ دیکھ لے
کہیں قدسیوں میں نہ گل کھلیں
کہیں کہکشاں کے نہ پر لگیں
ترے نقشِ پا کی تلاش میں
کہیں کھل نہ جائے نجوم پر — یہ حسین راز ابھی نہ جا
مرے سرو ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا

○

جو کبھی کسی نے سنی نہ ہوں — وہ کہانیاں بھی سناؤں گا
جو نشاطِ روحِ بہشت ہوں — میں وہ گیت خلد سے لاؤں گا
یہی شب ہے حاصلِ زندگی — اُسے لازوال بناؤں گا
کوئی خوابِ شوق کی حد نہ ہو
کوئی صبح تا بہ ابد نہ ہو
کوئی التجا مری رد نہ ہو
یہی خوابِ خلد نما رہے — یونہی خلد ساز ابھی نہ جا
مرے سرو ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا

جو بسی ہے تیرے خیال سے　　اُسی کائنات کا واسطہ
تجھے آہ جس سے گریز ہے　　اُسی التفات کا واسطہ
یہ جو بے ثبات ہے جذبِ دل　　اسی بے ثبات کا واسطہ
جو بہار رنگِ پریدہ ہے
جو قرار جانِ رسیدہ ہے
وہ دلِ روش سے کشیدہ ہے
جو نیازِ شوق سے ضد ہے کچھ　　تو بپاسِ ناز ابھی نہ جا
مرے سرو ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا

○

مجھے اب بھی وہمِ فراق ہے　　یہ عجیب وہم مٹا بھی دے
ابھی ہوش شاملِ کیف ہے　　یہ حجاب ہوش اُٹھا بھی دے
جو نہاں ہیں نرگسِ ناز میں　　وہی خواب مجھ کو دکھا بھی دے
رُخِ کائنات یونہی رہے
کششِ حیات یونہی رہے
یہ حسین رات یونہی رہے
چمنِ خلوص و وفا سے لے　　گُلِ امتیاز ابھی نہ جا
مرے سرو ناز ابھی نہ جا
مرے دلنواز ابھی نہ جا

مجھے نہ روک، ہم نشیں

چوتھائی صدی بیت گئی، "حُسنِ گریزاں" کے عنوان سے میں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کا مرکزی خیال یہ مصرع تھا "مرے سرو ناز ابھی نہ جا — مرے دلنواز ابھی نہ جا"۔ اشاعت کے بعد بہت دنوں تک ادبی حلقوں میں یہ نظم اظہارِ خیال کا موضوع بنی رہی۔ حال ہی میں[1] عالمِ سرخوشی سے اس کا جواب القا ہوا۔ نظم کے لباس میں دری شوخی جواب شہ پوشش ہے۔

مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی
نہیں ہے کیوں تجھے یقیں
میں کل ضرور آؤں گی

یہ جانتی ہوں زندگی طلسمِ خواہشات ہے
جو کل کو آج کر سکے یہ کس کے بس کی بات ہے
یہ دن جو بیت جائے گا تو پھر سہاگ رات ہے

نہ رنج کر، نہ ہو حزیں
میں کل ضرور آؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

[1] یہ نظم مرحوم کے کاغذات میں مع اس نوٹ کے ملی ہے جسے اُن کے صاحبزادے شاہد سعید صاحب نے ازراہِ کرم عنایت فرمایا ہے۔ تاریخ درج نہیں ہے، اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ "القا" کب ہوا تھا۔
(لطیف اعظمی)

یہ ہجر کیا ہے قُرب کیا؟ یہ سوز کیا ہے ساز کیا
یہ اضطرابِ شوق کیوں یہ درد کیا گداز کیا
یہ تشنگی ہے کس لئے ہے سرخوشی کا راز کیا
حیات کیا ہے، کیا نہیں
یہ سب حجاب اُٹھاؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

○

یہ رغبتِ شوق کس لئے یہ شعلۂ ہوس ہے کیوں
شریکِ خوابِ آشیاں تصوّرِ قفس ہے کیوں
فراغِ دل کی تاک میں کمندِ پیش و پس ہے کیوں
کہاں ہے منزلِ یقیں
یہ آنکھ سے دکھاؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

جمالِ ہم نشیں ہے کیا　　خیالِ یار ہی تو ہے
بہشت جس کا نام ہے　　وہ انتظار ہی تو ہے
جوابِ ظلمتِ خزاں　　شبِ بہار ہی تو ہے
بہار، ہاں وہ ہو کہیں
میں اُس کو کھینچ لاؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی۔

○

وہ شمع تو نہیں ہوں میں　　صبا جسے بُجھا سکے
وہ نقش تو نہیں ہوں میں　　ہوس جسے مِٹا سکے
وہ خواب تو نہیں ہوں میں　　جسے کوئی بُھلا سکے
مرے رفیقِ دل نشیں
میں کل ضرور آؤں گی
مجھے نہ روک ہم نشیں
میں کل ضرور آؤں گی

میرا ایشیا

حسین خوابوں کی روشنی میں سب خیالات سے گزر کر
جہاں جہاں تھا گمانِ فردوس ان حجابات سے گزر کر
غمِ وطن، اور غمِ زمانہ کے تلخ لمحات سے گزر کر
غمِ بشر جاگ اُٹھا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

○

سحر سے پہلے ہی ساحرانِ فرنگ کی نیند اُچٹ گئی ہے
کہ ان کی زنجیرِ کم نگاہی کی اک کڑی اور کٹ گئی ہے
کمندِ ظلمات خود ہمالہ کے پاؤں چھو کر پلٹ گئی ہے
یہ صبح کی ابتدا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

بکھر گئے رنگ و نسل کے خواب، سحرِ باطل کو نیند آئی
صدا یہ مشرق سے آ رہی ہے، تمام انساں ہیں بھائی بھائی
تبسّم جاوداں محبّت ہے، خندۂ مرگ ہے جُدائی
یہ زندگی کی صدا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

یہ ایشیا کی تڑپ نہیں ہے، حیات گر گر کر سنبھل رہی ہے
ضمیرِ انساں کی ہر صداقت نئے تصوّر میں ڈھل رہی ہے
قدامتِ زندگی کے سائے میں زندگی خود بدل رہی ہے
حجاب سا اُٹھ رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

نشاطِ پرویز سرنگوں ہے، ملالِ فرہاد جاگ اُٹھا ہے
غیورِ محکوم جاگ اُٹھے ہیں، جہانِ آزاد جاگ اُٹھا ہے
وہ صبح کی خلوتِ زر افشاں میں اک شفق زاد جاگ اُٹھا ہے
یہ فاصدِ ارتقا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

اسیرِ خود، رنگ و بُو کے شعلوں میں دامنِ احتساب ہوگا
مسلسل ایک نغمۂ مسرّت سکوتِ غم کا جواب ہوگا
جسے بشر نے چھپا دیا تھا وہ حُسن اب بے نقاب ہوگا
یہ مژدۂ برملا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

○

شکستِ پندار سے نگاہِ خزاں میں شرمندگی ملے گی
بہار اب جاوداں بنے گی گلُوں کو پایندگی ملے گی
بہشتِ آدم کی ہر کہانی کو اِک نئی زندگی ملے گی
یہ خواب سچ ہو رہا ہے شاید
یہی مرا ایشیا ہے شاید

(نئی روشنی ۱۴ ۲۴ اپریل ۱۹۴۹ء)

اے کشورِ ہندوستاں!

اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں
اے خُلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن!
کوثر ہے جن میں موجزن، اُن آبشاروں کے وطن!
نازاں ہے جن پر ایشیا، اُن کوہساروں کے وطن!
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

تھا زندگی کے نُور سے، معمُور کاشانہ ترا
اے شمعِ تہذیبِ کُہن عالم تھا پروانہ ترا
خورشید و انجم کو ابھی ہے یاد افسانہ ترا
وہ عہدِ زرّیں آج تک بھولا نہیں ہے آسماں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

ہم دوشِ شیخ و برہمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمعِ وطن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
فخرِ دلیرانِ وطن، اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

پھر شعلہ افشاں زمزمے آتش زنِ مضراب ہیں
پھر ولولوں کی تیز موجیں عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوانِ ہند کی ہر سانس میں بیتاب ہیں
بیداریوں کے قافلے، آزادیوں کے کارواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

ہے زیبِ دامانِ شفق، خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن ہیں نوجوانانِ وطن
اُفتاں و خیزاں بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

باطل کبھی تنویرِ حق کی تاب لا سکتا نہیں
شمعِ جلالِ حریت کوئی بجھا سکتا نہیں
کوئی بھی اب تجھ کو غلامستاں بنا سکتا نہیں
ہے ذرّے ذرّے کی رگوں میں رُوحِ آزادی رواں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

جنّت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا
آزادیٔ افکار کا مژدہ سنایا جائے گا
انسانیت کا تجھ کو گہوارہ بنایا جائے گا
وہ دن بہت نزدیک ہے از فضلِ ربِّ دوجہاں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں!

(نئی روشنی، یکم جنوری ۱۹۴۶ء)

جاگ اُٹھا ہے مِرا وطن

پرچم کشائے مہر و وفا ہے مرا وطن
انسانیت کے دل کی صدا ہے مرا وطن

میرے وطن کی خاک ہے نقّاشِ رنگ و بُو
میرا وطن ہے حُسنِ تمدّن کی آبرُو
میرا وطن ہے جلوہ گہِ شوق و آرزُو
آئینۂ ازل کی ضیا ہے مرا وطن

میرے وطن کی صبح ہے بیداریٔ شعُور
میرے وطن کی شام ہے اِک کاروانِ نُور
منسُوب ہے وطن سے مِرے عشق کا ظہُور
اُلفت سرشت و درد ادا ہے مرا وطن

گھر گھر مرے وطن میں اہنسا کی روشنی
ذرّوں میں ہے خلوص کی خوشبو بسی ہوئی
میرے وطن کا نام خیابانِ زندگی
رازآشنائے حُسنِ بقا ہے مرا وطن

اِک حیلہ ساز مائلِ مکر و دغا ہے آج
کل کا حلیف، دشمنِ مہر و وفا ہے آج
جو ہم سفر تھا، رہزنِ ناآشنا ہے آج
کھایا ہے زخم، جاگ اُٹھا ہے مرا وطن

اے چین، اے تمام عیان و نہاں، فریب
تیرا یقیں فریب ہے، تیرا گماں فریب
مِٹ جائے گا فریب ترا اے "جہاں فریب"
لے کر چراغِ صدق بڑھا ہے مرا وطن

رباعیات

سب نقشِ قدم چُھپا دیئے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مِٹا دیئے ہیں میں نے
جب سے دیکھا ہے خلوتِ دل میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دیئے ہیں میں نے

○

خوابِ شبِ ہجر بھُول جانے دے مجھے
اب حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا ، لباسِ امروز
اے حُسنِ ازل نقاب اُٹھانے دے مجھے

○

شر، خیر کے اسلُوب میں ڈھل جاتا ہے
پندار، خلُوصِ دل سے بدل جاتا ہے
وہ دل بھی ، جو ہو پارۂ سنگ و آہن
خوشبُوئے محبّت سے پگھل جاتا ہے

○

تمکینِ جمال کجکلاہی ہے کہ زُلف
عرش و طوبیٰ کی بادشاہی ہے کہ زُلف
ہے ہر خم و پیچ، شرحِ آیاتِ نجات
تفسیر صحیفۂ الٰہی ہے کہ زُلف

○

کلیوں کو شگفتگی، لجائے جیسے
صہبا، مینا میں تھرتھرائے جیسے
وہ جلوۂ بے نقاب، وہ شانِ حجاب
خورشید، شفق میں مسکرائے جیسے

○

دُنیا باتیں گھڑے تو چُپ ہی رہنا
ناحق تہمت جڑے تو چُپ ہی رہنا
قدرت، تیری طرف سے دے لے گی جواب
اے دوست! جو بن پڑے تو چُپ ہی رہنا

○

کیا مرگ ہے کیا حیات، میں کیا جانوں
کیا ہے پسِ کائنات، میں کیا جانوں
اے حلقۂ زُلفِ دوست عمر تو دراز
کہتے ہیں کِسے نجات، میں کیا جانوں

○

کونین سے دُور جا کے دیکھا ہے تجھے
شمعِ اِمکاں بُجھا کے دیکھا ہے تجھے
کیا ذکر یہاں نگاہ و دل کا اے دوست
میں نے تجھ سے چُھپا کے دیکھا ہے تجھے

○

رہزن میرا نہ خضرِ منزل میرا
طوفاں دشمن، نہ دوست ساحل میرا
کیا کم ہے یہی کہ اس بھری دُنیا میں
میں دل کا شریکِ حال ہوں، دِل میرا

غزلیات

وہ برقِ نازِ گریزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مگر شریکِ رگِ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دل ہے ترا مشرقِ مہ و خورشید
غبارِ منزلِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہارِ گُل کدۂ ناز دل کشا ہے، مگر
نسیمِ شوق خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہے خلوتِ دلِ ویراں ہی منزلِ محبوب
یہ خلوتِ دلِ ویراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک سانس ہو آتش کدہ تو کیا حاصل
گدازِ شعلۂ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بغیرِ عشق ہے رُودادِ زندگی تاریک
یہ لفظ زینتِ عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ شوق ہو یا اضطرابِ شوق رَوِش
اگر بمنزلۂ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(نئی روشنی، ۱۰ مارچ ۱۹۳۹ء)

زہرِ چشمِ ساقی میں کچھ عجیب مستی ہے
غرقِ کفر و ایماں ہیں دَورِ مے پرستی ہے

شمع ہے سرِ محفل کچھ کہا نہیں جاتا
شعلۂ زباں لے کر بات کو ترستی ہے

زُلفِ یار کی زد میں دَیر بھی ہے کعبہ بھی
یہ گھٹا جب اُٹھتی ہے دُور تک برستی ہے

آج اپنی محفل میں ہے بلا کا سنّاٹا
درد ہے، نہ تسکیں ہے، ہوش ہے، نہ مستی ہے

کون جا کے سمجھائے خود پرست دنیا کو
کیا صنم پرستی ہے، کیا خدا پرستی ہے

سخت جان لیوا ہے سادگی محبت کی
زہر کی کسوٹی پر زندگی کو کستی ہے

ہم تو رہ کے دلّی میں ڈھونڈتے ہیں دلّی کو
پُوچھیے رَوِش کس سے کیا یہی وہ بستی ہے

دسمبر ۱۹۶۰ء

○

کہنے کو سب فسانۂ غیب و شہود تھا
در پردہ، استعارۂ شوق و نمود تھا

سمجھا نہ بوالہوس، کسے کہتے ہیں اختصار
ناداں، اسیرِ کشمکشِ دیر و زُود تھا

کیا عاشقی ہیں، حوصلۂ مرگ و زندگی
خواب و خیال مرحلۂ ہست و بُود تھا

سوچا تھا میکدہ ہی سہی گوشۂ نجات
دیکھا تو اِک ہجومِ رسوم و قیُود تھا

جاں شاد کامِ بوسۂ پائے صنم ہوئی
کتنا بلند، طالعِ ذوقِ سجود تھا

یہ عشق تھا کہ جس نے دیا رنگِ شعلہ تاب
عالم تمام، نقشِ سکوت و جمود تھا

اے دوست اب وہ، دَورِ تامّل گذر چکا
جب دامنِ نظر پہ غبارِ حدُود تھا

شب ہم غزل سرا تھے رَوِش بزمِ ناز میں
شمعِ ادب شناس کے لب پر درود تھا

اکتوبر ۱۹۶۱ء

○

کیا ستم کر گئی اے دوست تری چشمِ کرم
جیسے تیرے نہیں، دُنیا کے گنہگار ہیں ہم

کوئی عالم ہو، بہر حال گزر جاتا ہے
ہم نہ سرگشتۂ راحت ہیں، نہ آشفتۂ غم

تری زُلفوں کی گھنی چھاؤں بہت دور سہی
جادہ پیما ہیں، حوادث کی کڑی دھوپ میں ہم

نکہتِ گُل سے کچھ اس طرح ملاقات ہوئی
یاد آیا تری بیگانہ وشی کا عالم

ہم ہیں، طوفانِ ملامت ہے، گلی ہے تیری
حُسنِ تقدیر سے ہوتے ہیں یہ حالات بہم

لے گیا عشق کسی شاہدِ نادیدہ تک
مدّتوں ذوقِ پرستش نے تراشے تھے صنم

ہم نے ہر عقدۂ دُشوار کا مُنھ چُوم لیا
کتنے دلکش ہیں تری زُلفِ گرہ گیر کے خم

کوئے قاتل ہی سہی منزلِ راحت نہ سہی
تھک کے بیٹھے ہیں کہ آتے ہیں بہت دور سے ہم

کوئے جاناں میں کہیں آج تو ہم بھی تھے روش
شکر ہے ہم کو نہ پہچان سکے دَیر و حرم

جولائی ۱۹۶۳ء

○

زندگی جب بھی شناسائے محالات ہوئی — سچ تو یہ ہے کہ خود اپنے سے ملاقات ہوئی
پردۂ غم جسے سمجھا تھا وہی خاموشی — کل تری بزم میں موضوعِ حکایات ہوئی
ہم کو لے قافلۂ شوق یہ کیا یاد رہے — کہ ہوئی صبح کہاں اور کہاں رات ہوئی
تری دزدیدہ نگاہی کا خیال آتے ہی — دل میں اِک روشنیِ کشفِ حجابات ہوئی
اس قدر سہل کہاں مرحلۂ سوز و گداز — رات بھر شمع کا جلنا بھی کوئی بات ہوئی
پاسِ آدابِ محبت کہ بہ ایں راز و نیاز — مدتوں بادِ صبا سے نہ کوئی بات ہوئی

جس کی محفل کو روشِ جنتِ فردا کہیئے
کل اسی خسروِ خوباں سے ملاقات ہوئی

اکتوبر ۱۹۶۳ء

○

نکہتِ زلف کو ہم رشتۂ جاں کہتا ہوں — ہوش آتا ہے تو خوابِ گریزاں کہتا ہوں
درد کو دولتِ صاحب نظراں کہتا ہوں — غم کو سرمایۂ عیسیٰ نفساں کہتا ہوں
کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے مگر اے شمعِ حرم — میں تجھے شعلۂ رخسارِ بتاں کہتا ہوں

قطرہ دریا ہے تو کیوں شورشِ دریا طلبی — ہر تمنّا کو محبت کا زیاں کہتا ہوں
ہے وہ آوازِ شکستِ دلِ گیتی جس کو — جرسِ قافلۂ عُمرِ رواں کہتا ہوں
تہمتِ سبزۂ بیگانہ ہے سنگِ بیداد — میں تو کانٹوں کو بھی پھولوں کی زباں کہتا ہوں
کون سمجھے گا مرے حُسنِ یقیں کا عالم — عرش و طوبیٰ کو حجاباتِ گماں کہتا ہوں

بندۂ خاک نشینانِ محبت ہوں روشؔ
خاک کو مسندِ آشفتہ سراں کہتا ہوں

جولائی ۱۹۶۶ء

○

خلوتیِ خیال کو ہوش میں کوئی لائے کیوں
شعلۂ طور ہی سہی ہم سے نظر ملائے کیوں
ہم سے کچھ اور ہی کہا، اُن سے کچھ اور کہہ دیا
بادِ صبا یہ کیا کیا، تُو نے یہ گُل کھلائے کیوں
قیس کا حاصلِ جنوں، ناقہ و محمل و حجاب
لیلیٰ نجد آشنا، خلوتِ دل میں آئے کیوں
عقل حریصِ خار و خس، صُورتِ شعلۂ ہوس
دولتِ سوزِ جاوداں عقل کے ہاتھ آئے کیوں

گردشِ مہر و ماہ بھی گردشِ جام بن گئی	صبح نہ لڑکھڑائے کیوں شام نہ جھوم جائے کیوں
طالبِ جلوۂ بہار دشتِ طلب ہے خار زار	وقت کسی کی راہ میں سندِ گُل بچھائے کیوں

حشر میں حُسن سے رَوِش شکوۂ روبرو غلط
روزِ ازل کی بات ہے آج ہی یاد آئے کیوں

فروری ۱۹۶۸ء

○

وہ نکہتِ گیسو پھر اے ہم نفساں آئی
اب دم میں دم آیا ہے اب جان میں جاں آئی

ہر طنز پہ رِندوں نے سر اپنا جھکایا ہے
اُس پر بھی نہ واعظ کو تہذیبِ مغاں آئی

جب بھی یہ خیال آیا کیا دَیر ہے، کیا کعبہ
ناقوسِ برہمن سے آوازِ اذاں آئی

اس شوخ کی باتوں کو دُشوار ہے دُہرانا
جب بادِ صبا آئی آشفتہ بیاں آئی

اُردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہے
وہ شخص مہذّب ہے جس کو یہ زباں آئی

یہ خندۂ گُل کیا ہے ہم نے تو یہ دیکھا ہے
کلیوں کے تبسّم میں چھپ چھپ کے فغاں آئی
آباد خیال اس کا شاداں رہے یاد اس کی
اِک دشمنِ دل آیا، اِک آفتِ جاں آئی
اشعارِ رَوِش سُن کر توصیف و ستائش کو
سعدی کا بیاں آیا حافظ کی زباں آئی

جون ۱۹۶۸ء

○

خِرد کو گُم شدۂ کو بہ کو سمجھتے ہیں
ہم اہلِ عشق تجھے روبرو سمجھتے ہیں

ترے خیال کی خوشبو ترے جمال کا رنگ
ہم اِس کو تکملۂ رنگ و بُو سمجھتے ہیں

کوئی مقام کوئی مرحلہ نظر میں نہیں
کہاں ہے قافلۂ آرزو سمجھتے ہیں

بتانِ شہر کو یہ اعتراف ہو کہ نہ ہو
زبانِ عشق کی سب گفتگو سمجھتے ہیں

ہزار فتنہ در آغوش ہے سکوں تیرا
تجھے ہم اے دلِ آشفتہ خو سمجھتے ہیں

ہزار منزلِ نو یک فراغِ گم شدگی
مآلِ حوصلۂ جستجو سمجھتے ہیں

فقیہِ شہر سے کیا پوچھیے روش کہ جناب
زبانِ شیشہ و جام و سبو سمجھتے ہیں

جون ۱۹۶۸ء

○

نقابِ شب میں چھپ کر کس کی یاد آئی سمجھتے ہیں
اشارے ہم ترے اے شمعِ تنہائی سمجھتے ہیں

نہ سمجھیں بات واعظ کی ہم اتنے بھی نہیں ناداں
کہاں تک ہے بساطِ عقل و دانائی سمجھتے ہیں

توجّہ پھر توجّہ ہے، مگر ہم تیرے دیوانے
تغافل کو بھی اِک اندازِ رعنائی سمجھتے ہیں

ہمیں ناآشنا سمجھو نہ رسم و راہِ منزل سے
کہاں لے جا رہا ہے ذوقِ رُسوائی سمجھتے ہیں

ہم ایسے سرپھروں کو کام کیا ہے مرگ و ہستی سے
یہ سب ہے شوخیٔ نازِ مسیحائی سمجھتے ہیں

ہم اے خلوت نشیں، آخر ہیں تیرے دیکھنے والے
یہ کیوں ہے اہتمامِ محفل آرائی سمجھتے ہیں

ردائے پاکی و تقوٰی کی عظمت میں تو کیا شک ہے
روشؔ! ہم تو غبارِ کوئے رُسوائی سمجھتے ہیں

جون ۱۹۶۸ء

○

ہجر کی آنچ سے نکھرا ہے رُخِ شامِ وصال
حل ہوا تیرے تغافل سے تمنّا کا سوال

ایک نشتر ہے ازل سے مرے دل میں پیوست
وہ تمنّا مجھے بخشی کہ جو ممکن نہ محال

وقت ہے اے دلِ بیدار نگہبانی کا
وادیٔ عقل میں ہے قافلۂ حُسنِ خیال

غازۂ عارضِ تہذیبِ محبّت ہے جُنوں
وحشتِ عشق ہے آرائشِ تمکینِ جمال

مجھ کو اے لغزشِ مستانہ مرے حال پہ چھوڑ
ہو سکے تجھ سے تو اب ساقیٔ محفل کو سنبھال

کھُل گئی آنکھ تو مزدور کی، اے صبحِ وطن
قصّۂ غیرتِ فرہاد ہوا خواب و خیال

کیا ہوئی آہ ترے غم کی مسیحانفسی
چہرۂ گردشِ دوراں نظر آتا ہے نڈھال

وضع داری ہی سہی، پاسِ محبّت نہ سہی
وضع داری کا سلیقہ بھی ہوا امرِ محال

کیا ہوا مل بھی گیا گر کوئی دُکھ کا ساتھی
بوجھ تیرا ہے کسی اور کے کاندھے پہ نہ ڈال

کم نگاہی نے حجابات کئے ہیں پیدا
ورنہ ہر ذرّۂ تاریک ہے خورشید مثال

شمع کے چہرۂ آشفتہ و افسردہ پہ
میں نے دیکھا ہے دمِ صبح عجب رنگِ جمال

مُنھ سے بول اُٹھتے ہیں پتّھر جو پکارے ایماں
رگِ ہر سنگ میں ہے شعلۂ آوازِ بلالؓ

میرے ہونٹوں پہ ہے ایّامِ جُدائی کا سکوت
چشمِ گیتی میں ہے افسانۂ شب ہائے وصال

ہم ہیں سر حلقۂ آشفتہ سرانِ گیتی
ہم سے اُلجھے یہ کہاں گردشِ دوراں کی مجال

منزلِ عشق فنا ہے نہ بقا ہے، اے دوست
گردِ پیراہنِ رہرو ہیں زوال اور کمال

آگیا کام روشِ زہر نشاطِ اُمّید
رنگ پہ آہی گیا نشۂ صہبائے ملال

اکتوبر ۱۹۶۸ء

○

لگی ہے بھیڑ بڑا میکدے کا نام بھی ہے
کچھ اس میں خوبیٔ رندانِ تشنہ کام بھی ہے

جنونِ شوق نے دل کو کیا تباہ، مگر
کچھ اس میں تیرے تغافل کا اہتمام بھی ہے

کتابِ زیست ہے یکسر حکایتِ غمِ دل
حکایتِ غمِ دل حرف ناتمام بھی ہے

سکونِ اہلِ خراباتِ عشق کیا کہئے
رُکی رُکی سی یہاں عمرِ تیز گام بھی ہے

بتانِ شہر ہم اہلِ وفا سے ہیں بیزار
بتانِ شہر کو اہلِ وفا سے کام بھی ہے

وہ شخص اپنی جگہ ہے مرقعِ تہذیب
یہ اور بات کہ قاتل اسی کا نام بھی ہے ۱؎

چراغِ صبح کی افسردگی نہیں تنہا
کہیں قریب یہیں آفتابِ شام بھی ہے

درِ صنم پہ رُکے ہیں، مگر بہ زیرِ قدم
ہزار سلسلۂ گردشِ مدام بھی ہے

جو خلوتوں میں سکوت آشنا رہا صبیحؔ کیوں
وہی روش سے سرِ بزم ہم کلام بھی ہے

۱۹۷۰ء

۱؎ آل انڈیا ریڈیو (دہلی) کے اسٹوڈیو میں مشاعرہ تھا، جس میں مرحوم نے یہ غزل سنائی۔ سامعین میں مَیں بھی شامل تھا۔ مرحوم نے جب یہ شعر پڑھا تو خوب داد ملی اور بار بار پڑھنے کے لئے درخواست کی گئی۔ نہ جانے کیوں یہ شعر سن کر میرا ذہن ایک خاص شخصیت کی طرف منتقل ہو گیا، جن کی وجہ سے مرحوم کو آل انڈیا ریڈیو (دہلی) سے الگ ہونا پڑا تھا۔ لوگوں کی غیر معمولی داد سے اس خیال کو اور تقویت ملی، مگر تعجب تھا کہ اس میں ریڈیو کے کارکن بھی برابر کے شریک تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد مرحوم نے یہ شعر پروفیسر محمد مجیب صاحب کو سنایا اور اس کا بھی ذکر کیا کہ ریڈیو کے مشاعرے میں خوب داد ملی۔ میں نے پوچھا کہ کیا کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہے۔ مرحوم نے فرمایا کیا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟ (عبداللطیف اعظمی)

○

عشق کی شرحِ مختصر کے لیے — سِل گئے ہونٹ عمر بھر کے لیے
زندگی دردِ دل سے کترا کر — دردِ سر بن گئی بشر کے لیے
ل ازل سے ہے شعلہ پیراہن — شمع جلتی ہے رات بھر کے لیے
س نے دل توڑ کر کیا ارشاد — اب تسلّی ہے عمر بھر کے لیے
رحمت ہے عشق کا دامن — آتشِ رزمِ خیر و شر کے لیے
م بھی کوئے بتاں کو جاتے ہیں — اے صبا! قصد ہے کدھر کے لیے
ہ تجلّی ہے منتظر اب تک — کسی شائستہ نظر کے لیے

خونِ دل صرف کر رہا ہوں روشؔ
خوب سے نقشِ خوب تر کے لیے

۱۹۷۰ء

○

کون کہتا ہے مجھے شائستۂ تہذیبِ جنوں
میں تری زلفِ پریشاں کو اگر چھیڑ نہ دوں
کون حسرت زدۂ شوقِ تکلّم ہے یہاں
لڑکھڑاتا ہے تری چشمِ سخن گو کا فسوں

یہ ہجومِ غمِ دوراں میں کہاں یاد رہا
داستانِ غمِ دل تیرے تغافل سے کہوں

کیا خبر خیمۂ لیلیٰ کی نگہبانوں کو
کہ حریمِ دلِ لیلیٰ میں ہے مہمان جنوں

رنگ رہ رہ کے ترے رُخ کا اُڑا جاتا ہے
ورنہ میں اور تری محفلِ تمکیں سے اُٹھوں

قیدِ ہستی میں یہ اِک گوشۂ دامانِ خیال
پھر غنیمت ہے کہ زنداں میں بھی آزاد تو ہوں

ہو سلیقے سے بہکنا تو مزہ دیتا ہے
مرے ساقی کو گماں ہے کہ بہت ہوش میں ہوں

جستجو کی کوئی منزل جو نہیں ہے تو نہ ہو
ہمتِ عشق یہ کہتی ہے کہ بڑھتا ہی رہوں

اب ترے حال پہ تجھ کو دلِ ناداں چھوڑا
سوچنا بھی تو قیامت ہے کہاں تک سوچوں

میں نے پہچان لیا اس کو سرِ بزم روشؔ
اس کی آنکھوں کو ہے اصرار کہ خاموش رہوں

۱۹۷۰ء

○

بادۂ گل کو سب اندوہ رُبا کہتے ہیں
اشکِ گلرنگ میں ڈھل جائے تو کیا کہتے ہیں

فرصتِ بزم بھی معلوم کہ اربابِ نظر
شعلۂ شمع کو ہم دوشِ صبا کہتے ہیں

یہ مسلسل ترا پیماں، تری پیماں شکنی
ہم اسے حاصلِ پیمانِ وفا کہتے ہیں

قصرِ آزادیٔ انساں ہی سہی، میخانہ
درِ میخانہ کی زنجیر کو کیا کہتے ہیں

یہ رہِ غم کے خم و پیچ عجب ہیں، جن کو
خوش نظر، سایۂ گیسوئے رسا کہتے ہیں

عشق خود اپنی جگہ مظہرِ انوارِ خدا
عقل اس سوچ میں گم کس کو خدا کہتے ہیں

کوئی کس دل سے بھلا، ان کا بُرا چاہے گا
جو بھلے لوگ بُروں کو بھی بھلا کہتے ہیں

دل نشیں تیرے سوا کوئی نہیں کوئی نہیں
کون ہیں وہ جو تجھے دل سے جُدا کہتے ہیں

یہی دیوانہ جو پھولوں سے بھی کتراتا ہے
کیا اِسی کو روشِ آبلہ پا کہتے ہیں

١٩٧٠ء

○

رنگ پر جب وہ بزمِ ناز آئی — ہم اُٹھے لے کے دردِ تنہائی
کس سے پوچھیں طلسمِ ہستی میں — ہم تماشا ہیں یا تماشائی
تھا غمِ عشق جاں گداز مگر — کچھ اُسی غم نے کی مسیحائی
ہائے کس سادگی سے سیکھا ہے — حُسن نے اہتمامِ رعنائی
آخرِ شب زبانِ شمع پہ ہے — داستانِ ہجومِ تنہائی
چند خونیں جگر ہوئے رُسوا — مُسکرایا چمن بہار آئی
چُپ رہے ہم تو خوں ہوا دل کا — بات کی ہے تو آنکھ بھر آئی
ہائے اِس دورِ عقل و دانش نے — کر دیا آدمی کو سودائی

ہم چمن میں نہ تھے تو خود ہی روش
بوئے گُل دشت تک چلی آئی

(غیر مطبوعہ)

○

کیا کہوں کیا ملا ہے کیا نہ ملا — دل بھی شایانِ دلرُبا نہ ملا
تلخیٔ زندگی، ارے توبہ — زہر میں زہر کا مزا نہ ملا

ہم کو اپنی خبر، نہ دامن کی — چشمِ رحمت کو اِک بہانہ ملا

لاکھ ملنے کا ایک ملنا ہے — کہ ہمیں اذنِ التجا نہ ملا

فتنۂ رند و محتسب توبہ — برملا کوئی پارسا نہ ملا

تھی بڑی بھیڑ اس کے کوچے میں — خضر آئے تھے راستا نہ ملا

کس سے ملئے رَوِش کر دلی میں

سب ملے وہ خود آشنا نہ ملا — (غیر مطبوعہ)

دورِ صبوحی، شعلۂ مینا رقصاں چھاؤں میں تاروں کی

پیرِ مغاں نے جام اُٹھایا، عید ہوئی میخواروں کی

کتنے ہی در کھل جائیں گے، جوشِ جنوں کو بڑھنے دو

بند رہے گا کیا درِ زنداں خیر نہیں دیواروں کی

کافرِ عشق سمجھ کر ہم کو کتنے طوفاں اُٹھتے ہیں

دل کی بات کو کس سے کہہ دیں، بستی ہے دیں داروں کی

پاسِ ادب سے اِک اِک کانٹا ہم نے چُنا ہے پلکوں سے

آخر کچھ تعظیم تھی لازم دشتِ وفا کے خاروں کی

کتنے دُکھ کے دن بیتے ہیں اس کا بھی تھا ہوش کہاں

اپنے حال کو کچھ سمجھا ہوں صورت سے غم خواروں کی

زُلفِ پریشاں رازکی جُویا، بادِ صبا یکسر غمّاز
بات تری خلوت تک پہنچی ہم وحشی آواروں کی
موسمِ گُل کی رعنائی نے دشت میں ڈیرے ڈالے ہیں
تم بھی رَوِش اب گھر سے نکلو رُت آئی ہے بہاروں کی

○

شکستِ رنگِ تمنّا کو عرضِ حال کہوں
سکوتِ لب کو تقاضائے صد سوال کہوں
ہزار رُخ ترے ملنے کے ہیں نہ ملنے میں
کسے فراق کہوں اور کسے وصال کہوں
مجھے یقیں ہے کہ کچھ بھی چھپا نہیں ان سے
انہیں یہ ضد کہ دلِ مبتلا کا حال کہوں
تُو بے مثال سہی پھر بھی دل کو ہے اصرار
ادا ادا کو تری عالمِ مثال کہوں
مزاجِ محفلِ گیتی اگر نہ برہم ہو
تو رنگِ عیش کو گردِ رُخِ ملال کہوں
ہوا کے دوش پہ ہے ایک شعلۂ لرزاں
کہوں تو کیا تری تہذیب کا مآل کہوں

وہ ایک خواب جو تعمیر آپ ہے اپنی
میں کیا حقیقتِ رعنائیٔ خیال کہوں
غزل کی بات رہے گی وہیں اگر سَو بار
جوابِ شوخی و رعنائیٔ غزال کہوں
روِش یہ سادگیٔ عشق کا تقاضا ہے
کمالِ ہوش کو اخلاص کا زوال کہوں (غیر مطبوعہ)

○

حُسنِ اصنام، بہ ہر لمحہ فزوں ہے کہ نہیں
یہ مرے ذوقِ تماشا کا فسوں ہے کہ نہیں
کچھ تو ارشاد ہو اے تمکنتِ آنِ جمال
عشق شائستۂ تہذیبِ جنوں ہے کہ نہیں
یہ جہانِ مئے و مینا و سُبو، اے واعظ!
پرتوِ نرگسِ مستانہ ہے، کیوں ہے کہ نہیں
شعلۂ شمع سے خاکسترِ پروانہ تک
ایک ہی سلسلۂ سوزِ دروں ہے کہ نہیں
حلقۂ بادِ صبا، تذکرۂ زلفِ صنم
اس میں کچھ شائبۂ ذوقِ جنوں ہے کہ نہیں

بستے جاتے ہیں نگر، دل ہیں تباہ و ویراں
آگہی دشمنِ دنیائے سکوں ہے کہ نہیں
ہم وہ ہیں آج زدش، صاحبِ دیوانِ غزل
یہ سب اس چشمِ سخن گو کا فسوں ہے کہ نہیں

(غیر مطبوعہ)

○

تجھ پہ کھل جائے کہ کیا مہر کو شبنم سے ملا
آنکھ اے حُسنِ جہاں تاب ذرا ہم سے ملا
وہ مسرّت جسے کہتے ہیں نشاطِ ابدی
اُس مسرّت کا خزانہ بھی ترے دم سے ملا
وحدتِ صورت و معنیٰ کو سمجھ اے واعظ!
حُسنِ یزداں کا تصوّر رُخِ آدم سے ملا[1]
اہلِ وحشت سے یہ تزئینِ جہاں کیا ہوتی
یہ سلیقہ بھی ترے[2] گیسوئے برہم سے ملا
ہم نشیں، سوزِ غمِ دل کہیں محدود نہیں
کبھی شعلوں سے ملا ہے، کبھی شبنم سے ملا

---

[1] مسودہ میں یہ مصرع یوں بھی ہے: "سلسلہ حسنِ بشر کا رُخِ یزداں سے ملا"
[2] "ترے" کے اوپر "اسی" بھی لکھا ہوا ہے۔ (لطیف اعظمی)

لڑکھڑانا بھی ہے تکمیلِ سفر کی تمہید
ہم کو منزل کا نشاں لغزشِ پیہم سے ملا
وضع داری اسے کہیے کہ حرم میں بھی روِش
خود ہی بڑھ کر کسی غارت گرِ عالم سے ملا

(غیر مطبوعہ)

○

خوابِ دیدار نہ دیکھا ہم نے — غائبانہ انھیں چاہا ہم نے
کم نہ تھا عشق ازل سے رُسوا — کر دیا اور بھی رُسوا ہم نے
زندگی محوِ خود آرائی تھی — آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا ہم نے
راہ سے دُور نظر آئے جو خار[1] — ان کو پلکوں سے اُٹھایا ہم نے
لے لیا کوہِ حوادث سر پر — وقت کے دل کو نہ توڑا ہم نے
کر دیا فاش ترا غم لے کر[1] — رازِ اعجازِ مسیحا ہم نے
کوہِ سنگینِ حقائق تھا جہاں — حُسن کا خواب تراشا ہم نے

درد آلودۂ درماں تھا روِش
درد کو درد بنایا ہم نے

(غیر مطبوعہ)

---

[1] یہ دونوں مصرعے حسبِ ترتیب یوں بھی ہیں:

دور افتادہ نظر آئے جو خار
کر دیا فاش ا غمِ دل لے کر

○

ایک لغزش میں درِ پیرِ مغاں تک پہنچے
ہم بھٹکتے تھے کہاں اور کہاں تک پہنچے

لطف تو جب ہے کہ اے محرمِ حُسنِ گفتار
ہو کوئی بات مگر محسنِ بُتاں تک پہنچے

یہ بھی کچھ کم نہیں اے رہروِ اقلیمِ یقیں
ہم خرابات نشیں حُسنِ گماں تک پہنچے

طے ہوئی منزلِ خارا شکنی دو دن میں
لوگ صدیوں میں دلِ شیشہ گراں تک پہنچے

ذوقِ شیرینیِ گفتار فزوں اور ہوا[1]
زہر جتنے تھے وہ سب اہلِ زباں تک پہنچے

وہ کہاں درد جو دل میں ترے محدود رہا
درد وہ ہے جو دلِ کون و مکاں تک پہنچے

آگ بھڑکی ہے تو اب کون یہ کہہ سکتا ہے
شعلۂ دامنِ تہذیب کہاں تک پہنچے

ماورا لفظ و بیاں سے ہے وہ حُسنِ ازلی
کم نظر مرحلۂ لفظ و بیاں تک پہنچے

فیضِ محرابِ غزل ہے کہ روش اہلِ نظر
حُسن و رعنائیِ اندازِ بیاں تک پہنچے (غیر مطبوعہ)

---

[1] یہ مصرع اس طرح بھی ہے: لطفِ شیرینیِ اندازِ بیاں کم نہ ہوا

UBH
RTERLY

NOVEMBER, 1971

RAVISH NUMBER

Editor : A. L. AZMI